اکتوبر ۱۹۶۲ء

نگراں: نیاز فتحپوری

نگار پاکستان

سالانہ چندہ
دس روپے

قیمت فی کاپی
پچھتر پیسے

من و یزداں (زیر طبع)

(انجیل انسانیت)

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کرکے تمام بنی نوع انسانی کو انسانیت کبریٰ اور اخوت عام کے ایک نئے رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور مذاہب کی تحقیق و دینی عقائد و رسالت کے مفہوم اور کتب مقدسہ پر تاریخی و علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطہ نظر سے نہائت بلند انشاء اور پر زور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔

مولانا نیاز فتحپوری نے اسے ازسر نو مرتب کیا ہے۔

قیمت آٹھ روپے

رجسٹرڈ ایس نمبر ۲۴۷۲

ٹیلیفون :- ۷۹۴۶۵

اکتوبر ۱۹۶۲ء

نگراں
نیاز فتحپوری

مدیر
عارف نیازی

زرسالانہ
دس روپے

قیمت فی کاپی
۷۵ پیسے

ادارۂ اشاعت
دفتر نگار پاکستان۔ ۳۲ گاندھی گارڈن مارکیٹ۔ کراچی ۳

رشدہ برائے مدارس کراچی ریجن بموجب سرکلر نمبر ڈی / ایف - یو پی - بی / ۳۶۶۹ - ۶۲/۷۶۸ - محکمہ تعلیم کراچی

مضحکہ خیز نہیں

بلکہ قابلِ رحم !

خدا کسی کا نزلہ، زکام سے پالا نہ ڈالے۔ اس کے ہاتھوں انسان کی حالت قابلِ رحم ہو جاتی ہے۔ لیکن سعالین کا بروقت استعمال آپکو اس مصیبت سے محفوظ رکھے گا۔ یہ اس کا علاج بھی ہے اور اس سے بچنے کا ایک مؤثر ذریعہ بھی۔

سعالین

نزلہ، زکام اور کھانسی کے لئے

برنیکس

گلے، ناک اور سینے پر ملنے سے سوزش اور جکڑن دُور ہو کر فوری افاقہ محسوس ہوتا ہے اور مرض کی شدّت بہت حد تک کم ہو جاتی ہے۔

ہمدرد (وقف) لیبوریٹریز پاکستان

کراچی ڈھاکہ لاہور چٹاگانگ

M.69-20-874

فہرست

اکتالیسواں سال | فہرست مضامین۔ اکتوبر سنہ ۱۹۶۲ء | شمارہ ۹

فہرست مضامین ۳

ملاحظات ..... نیاز ۴

مومن کی ہنر بندیاں ..... نیاز ۵

سلاطین دہلی اور مغل بادشاہوں کے کھانے ..... صباح الدین عبدالرحمٰن ۹

جگن ناتھ آزاد کا ایک خط ڈاکٹر نارنگ کے نام .. جگن ناتھ آزاد ۱۵

مومن کی حیات معاشقہ ..... فرمان فتحپوری ۱۹

نوراللغات اور فرہنگ اثر ..... طاہر محسن کاکوروی ۳۰

ابوریحان محمد بن احمد خوارزمی بیرونی ..... ممتاز مرزا ۳۷

باب الاستفسار ..... الحرب خدعۃ ۔ جعفر دعباسہ
..... پرسی پولس ۔ دیوان مخفی } نیاز ۴۰
دارا ۔

رنگ تغزل ..... مختلف شعراء ۴۵

مطبوعات موصولہ ۵۱

زندگی اور ادب (ضمیمہ) ..... سید صفدر حسین ..... ا — ۸

ضروری اعلان

حضرت نیاز فتحپوری اب کراچی آگئے ہیں اور "نگار پاکستان" کی عنانِ ادارت انھوں نے اپنے ہاتھ میں لے لی ہے۔ اس لئے امید ہے کہ آپ نگار کی توسیع اشاعت میں سعی بلیغ سے کام لیں گے۔ ورنہ بہ حالت موجودہ پاکستان میں اس کی اتنی اشاعت نہیں ہے کہ وہ اپنے مصارف بھی پورے کرسکے اور اس کا جو نتیجہ ہو سکتا ہے۔ اس کے اظہار کی ضرورت نہیں۔

(منیجر نگارِ پاکستان)

ملاحظات

مصائب اور تھے پر دل کا جانا
عجیب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

کچھ ایسی ہی بات بعض احباب نے میری ہجرت پاکستان کے متعلق بھی ظاہر کی ہے اور سچ پوچھئے تو کبھی کبھی خود مجھ میں بھی قریب قریب یہی احساس پیدا ہوتا ہے، لیکن اگر میرا یہ اقدام محض جذباتی مجبوری کا نتیجہ ہوتا تو غالباً یہ تاثر بہت دیرپا اور سنگین صورت اختیار کر لیتا۔ لیکن چونکہ اس کا تعلق میری ذات سے کم اور نگار کے مستقبل سے زیادہ تھا۔ اس لئے جو کچھ میں نے کیا، اس پر نہ میں پشیماں ہوں نہ متاسف!

عمر کے جس دور سے میں گزر رہا ہوں اس کا تقاضا تھا کہ اپنی زندگی کے باقی ایام (خواہ وہ کتنے ہی کم کیوں نہ ہوں) ایسے ماحول میں بسر کروں جو کسی حد تک میری ذہنی تشویش اور احساس ضعف و ناتوانی کو دور کر سکے، جہاں میں نسبتاً زیادہ سکون کے ساتھ نگار کی خدمت کر سکوں اور یہ فضا مجھے کراچی ہی میں میسر آسکتی تھی، جہاں۔ مجھ سے بے غرض محبت کرنے والے، بھی موجود ہیں اور نگار کے کام میں مجھے سہارا دینے والے بھی ——— لکھنؤ میں یہ دونوں باتیں ختم ہو چکی تھیں ——— رہا اس سلسلہ میں یہ سوال کہ ایسا کیوں ہوا۔ سو اس کا جواب میں کیوں دوں ——— جبکہ اس کا مداوا نہ آپ کے پاس ہے نہ میرے پاس۔!

ہندوستان کے خریداران نگار

مطمئن رہیں کہ جب تک ان کا چندہ ختم نہیں ہوتا، نگار پاکستان بدستور ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہے گا، ..... لیکن ترسیل زر اور توسیع خریداری کا مسئلہ البتہ بہت دشوار ہے۔ سو اس کے متعلق بھی ہم غور کر رہے ہیں اور اگر کوئی صورت ایسی پیدا ہو گئی کہ نگار کا چندہ وہیں ادا ہوتا رہے، تو ہم آپ کو علیحدہ خط کے ذریعہ سے مطلع کر دیں گے۔

اس دوران میں اگر آپ خود کوئی صورت ایسی پیدا کر سکتے ہوں کہ نگار کا چندہ کسی ذریعہ سے یہیں وصول ہو جائے، تو اس کی کوشش ضرور کیجئے۔

بینک کے ذریعہ سے بھی آپ روپیہ بھیج سکتے ہیں، لیکن اس کے لئے جو درمیانی مراحل آپ کو طے کرنا پڑیں گے وہ اتنے آسان نہیں کہ یہ ذریعہ اختیار کرنے پر میں آپ کو مجبور کروں۔

نیاز

مومنؔ کی ہنر بندیاں

(نیاز فتحپوری)

کلامِ مومنؔ کے متعلق ملک کے مختلف نقادوں اور تبصرہ نگاروں کی رائیں آپ کی نظر سے گزر چکی ہونگی۔ اب خود مومنؔ نے اپنی غزلگوئی پر جو تبصرہ کیا ہے وہ بھی سن لیجئے۔ کہتے ہیں:۔

مومنؔ سے اچھی ہو غزل تھا اس لئے یہ زور شور　　کیا کیا رضا میں لائے ہیں ہم کس کس ہنر سے باندھ کر

دوسرے ادیبوں اور نقادوں نے مومنؔ کے جس ابداع و اختراع، جس نزاکتِ تخیل و جدت بیان کا ذکر مختلف عنوانات کے تحت کیا ہے ان کو مومنؔ نے صرف ایک لفظ ہنر بندی سے ظاہر کر دیا ہے۔

اس میں شک نہیں ہنر بندی بڑی وسیع اصطلاح ہے اور اس میں وہ سب کچھ شامل ہے جو محاسن کلام مومنؔ کے سلسلہ میں کہا جا سکتا ہے۔ لیکن غالباً مومنؔ نے اس کو زیادہ وسیع مفہوم میں استعمال نہیں کیا، بلکہ اس کو محدود کر دیا ہے صرف اس شاعرانہ تعبیر و تعلیل تک جو اپنی جگہ یقیناً کتنی ہی عجیب و نادر کیوں نہ ہو لیکن تغزل سے اسے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ کس قدر عجیب بات ہے کہ مومنؔ جس چیز کو ہنر بندی قرار دیتے ہیں۔ ہمارے نزدیک وہی ان کی سب سے زیادہ بے اعتدالی ہے۔

ظاہر ہے کہ جس غزل کا یہ مقطع ہے اس میں مومنؔ نے یقیناً بڑی ہنر بندی سے کام لیا ہوگا۔ لیکن کس قدر مایوسی ہوتی ہے یہ دیکھ کر کہ مقطع کو چھوڑ کر اشعار کی اس غزل میں کوئی ایک شعر بھی ایسا نہیں جسے ہم صحیح معنی میں غزل کا شعر کہہ سکیں۔ مطلع اور حسن مطلع جس میں انہوں نے ہنر بندی سے کام نہیں لیا وہ بھی کچھ نہیں ہیں۔ لیکن بعد کے چھ اشعار جن میں مومنؔ نے ہنر بندی سے کام لیا ہے وہ "کچھ نہیں" سے بھی زیادہ منفیت اپنے اندر رکھتے ہیں۔

لے تند خو آجا کہیں تیغا کمر سے باندھ کر　　کن مدتوں سے ہم کفن پھرتے ہیں سر سے باندھ کر

یا وہ ڈبوئے گا زمیں، یا ہم ڈبوئیں گے فلک　　آجائے تو روتے ہیں ہم شرطِ ابر تر سے باندھ کر

یہ ہیں غزل کے ابتدائی دو شعر جن کو پڑھ کر اگر تنفس پیدا نہ ہو تو بھی ان میں کوئی بات ایسی نہیں جسے مومنؔ ہنر بندی کہہ سکیں یا ان کو سن کر کوئی فنی و معنوی لطف حاصل ہو سکے۔ تیغا اگرچہ وہ لفظ ہے لیکن چونکہ تیغ نظم نہ ہو سکتا تھا اس لئے اس میں الف کا اضافہ کر دیا۔ "کن مدتوں سے" کہنا بھی فصیح انداز بیان نہیں۔

دوسرے شعر کے پہلے مصرعہ میں تقابل صحیح نہیں۔ مقابلہ زمین کے ڈبونے میں ہے اسلئے فلک کا ذکر بے محل ہے۔ مصرعہ یوں ہونا چاہیئے تھا۔ یا وہ ڈبوئیگا زمیں یا ہم ڈبوئیں گے اسے۔ اور اگر فلک کی غرقابی کا ذکر کر کے اپنی برتری ثابت کرنا مقصود تھا تو پہلا مصرع یوں ہونا چاہیئے۔

گر وہ ڈبوئے گا زمیں، تو ہم ڈبوئیں گے فلک

لیکن خیر چونکہ ان اشعار کا تعلق ہنر بندی سے نہیں ہے اس لئے ان کے متعلق مزید جرح و قدح کا موقع نہیں۔ اب باقی چھ اشعار دیکھئے جن میں واقعی ہنر بندی سے کام لیا گیا ہے۔ اور حیرت کیجئے مومنؔ پر جو اپنے مقطع میں اس ہنر بندی کی داد بھی چاہتا ہے۔ تیسرا شعر ہے۔

خط میں تو لکھ سکتا نہیں۔ احوالِ سوزِ دل اسے　　پر بھیجدوں جی میں ہے پروانے کے پر سے باندھ کر

شعر کا مفہوم یہ ہے کہ خط میں تو سوزِ دل کا حال لکھنا ممکن نہیں، اس لئے جی چاہتا ہے کہ خط پروانے کے پر سے باندھ کر بھیجدوں۔ تاکہ پروانے کو دیکھ کر محبوب میرے سوزِ دل کا اندازہ کر سکے۔ اب غور کیجئے کہ مومن نے اپنی ہنر بندی کے زعم پر کتنے غلط مفروضات سے کام لیا ہے۔ اول تو پروانہ کے پر سے خط باندھا جانا ممکن نہیں (کبوتر کے پر سے، البتہ باندھا جا سکتا ہے) دوسرے یہ کہ پروانہ کوئی پرندہ نہیں جو اڑ کر محبوب تک جا سکے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ مومن نے امر واقعی کی صورت سے نہیں بلکہ محض تمنا کے انداز میں یہ اندازِ بیاں اختیار کیا ہے۔ اور اس سے مقصود صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ "میرے سوزِ دل کا بھی وہی عالم ہے جو پروانے کا ہے"۔ لیکن "ہنر بندی" نے اس مفہوم کو جو بجائے خود واقعی کافی اثر انگیز ہے، بالکل بے اثر کر دیا۔ علاوہ اس کے دوسرے مصرعہ میں "شکست" کا عیب بھی پیدا ہو گیا اور تقطیع میں پروانے کے دو ٹکڑے ہو گئے جن کو ملا کر ایک ساتھ نہیں پڑھا جا سکتا۔ ہر چند یہ عیب اکثر اساتذہ کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ لیکن ہے بہر حال قابلِ احتراز۔ چنانچہ جہانگیر کے سامنے جب ایک شاعر نے "اے تاج دولت برسرت" پڑھا تو جہانگیر کے تیور بگڑ گئے۔ کیونکہ تقطیع میں دولت کے دو ٹکڑے ہو کر دوسرا ٹکڑا "لت برسرت" ہو جاتا ہے جو صناً بڑی توہین کی بات ہے۔

چوتھا شعر ہے:— دشمن سگِ کو چہ نہ ہو، اس شوخ آہو چشم کا
نامہ ہوں کب گرگ پائے نامہ بر سے باندھ کر

مومن محبوب کی طرف ایک نامہ بر بھیجتے ہیں۔ اور اس کے پاؤں میں بھیڑیئے کے ٹخنے کی ہڈی باندھ دیتے ہیں کیونکہ (کہا جاتا ہے) اس ہڈی کے باندھنے سے سفر کی صعوبت کم ہو جاتی ہے۔ لیکن پھر یہ خیال آتا ہے کہ کہیں کوچۂ محبوب کا کتا اس کا دشمن نہ ہو جائے۔ (کتے اور بھیڑیئے کی دشمنی مشہور ہے) اس لئے وہ اپنے کئے پر اظہارِ ندامت کرتے ہیں۔

اس شعر میں مومن کی ہنر بندی صرف اس پر موقوف ہے کہ انہوں نے کتا، بھیڑیا اور ہرن تین جانوروں کو اکٹھا کر دیا ہے۔ نفسِ مضمون یکسر تغزل سے خالی ہے۔ اور مبالغہ کی نہایت نامطبوع مثال۔ ..... دوسرے مصرعے میں بھی شکست کا عیب ہے کیونکہ پائے کے دو ٹکڑے تقطیع میں ہو جاتے ہیں۔

پانچواں شعر ہے:— ہے سرخ پٹکا اور خونِ غیر میں رنگا ہوا کیا قتل پر میرے کمر نکلے ہو گھر سے باندھ کر

مصرعِ اول میں خونِ غیر کی تخصیص غیر ضروری ہے۔ اگر پٹکا خونِ غیر میں رنگا ہوا نہ ہوتا تو کیا وہ مومن کے قتل کرنے کے لئے گھر سے نہ نکلتا۔ رنگا ہوا کا کاف بھی مشدد نظم ہوا ہے جو یقیناً تکسال باہر بات ہے۔ پہلا مصرع اگر یوں ہوتا کہ

ہے سرخ پٹکا اور وہ بھی خون سے رنگین ہے۔

مصرعِ ثانی میں کمر اور باندھ کر کے درمیان ایک پورا فقرہ "نکلے ہو گھر سے" بڑی معیوب تعقید ہے۔ مفہوم کے لحاظ سے شعر تغزل سے معرا ہے۔

چھٹا شعر ہے:— آ جھانک تو بھی تو کہیں بے دید کیسی ٹکٹکی!!
بیٹھے ہوئے ہیں روزنِ دیوار و در سے باندھ کر

بے دید مومن نے بے مروت کے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ محبوب سے خطاب کر کے کہتے ہیں کہ اے بے مروت تو بھی تو کبھی جھانک کر دیکھ لے کہ ہم روزنِ دیوار و در سے کیسی ٹکٹکی باندھ کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ٹکٹکی پہلے مصرع میں ہے اور باندھ کر دوسرے مصرع کے آخر میں اور اس قسم کی تعقیدات مومن کے یہاں اکثر پائی جاتی ہیں۔ ساتواں شعر ہے:—

جراح کیا سوجھا تجھے کیا رنگ دیکھا کیا ہوا کیوں کھول لی پٹی مرے زخمِ جگر سے باندھ کر

اس شعر میں مومن نے کسی ہنر بندی سے کام نہیں لیا اور دوسرے مصرعہ کا یہ کنائی مفہوم کہ زخمِ جگر لا علاج ہے بہت پر لطف ہے۔

آٹھواں شعر ہے:— دیوانۂ نازک ہوں میں فصادِ مژگانِ نیشتر
لے فصد میرے ہاتھ کو تارِ نظر سے باندھ کر

اس شعر میں "فصادِ مژگانِ نیشتر" کی ترکیب یقیناً مومن کی ہنرمندی کی بڑی اچھی مثال ہے۔ اس فقرہ میں فصاد یا محبوب سے خطاب ہے جس کی صفت "مژگانِ نیشتر" ظاہر کی گئی ہے۔ یعنی وہ فصاد جو اپنی مژگان سے نیشتر کا کام لیتا ہے۔ شعر کا مفہوم یہ ہے کہ "میں بڑا نازک طبع دیوانہ ہوں اس لئے اے فصاد اگر تو نیشتر مژگان سے فصد کھولنا چاہتا ہے تو پہلے میرے ہاتھ کو تارِ نظر سے باندھ لے (قاعدہ ہے کہ فصد لینے سے پہلے ہاتھ پر پٹی باندھ دیتے ہیں)۔

اس شعر میں مومن صرف یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ میری دیوانگی کا علاج صرف محبوب کی توجہ نظر ہے۔ لیکن اس کو ایک خاص ہنرمندی سے ظاہر کیا ہے جو مکرر دمعیوب تو نہیں لیکن ایک حد تک دور از کار ضرور ہے۔

یہ تھی وہ غزل جس کے مقطع میں انہوں نے اپنی ہنرمندی کا اظہار بڑے زور شور سے کیا ہے اور اسے واقعی بڑی حد تک نبھایا بھی ہے۔ لیکن اس غزل سے قطع نظر یوں بھی ان کے کلام میں ہنرمندیوں کی مثالیں بکثرت نظر آتی ہیں۔ علی الخصوص ان غزلوں میں جہاں وہ قصیدہ گوئی کی مشکلات میں پھنس گئے ہیں اس قسم کی غزلوں میں ان کی سب سے پہلی غزل جو حمد و نعت سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے بعض اشعار ہنرمندی کی بڑی واضح مثال ہیں۔

۱— بچاؤں آبلہ پائی کو کیونکر خارِ ماہی سے
کہ بامِ عرش سے پھسلا ہے یارب پاؤں وحشت کا

یعنی حمد کے سلسلہ میں میری نکتہ سنجیوں کا پاؤں عرش سے پھسلا ہے اس لئے میں اپنی آبلہ پائی کو خارِ ماہی سے کیونکر بچا سکتا ہوں۔

اس شعر کا حقیقی مفہوم سمجھنے کے لئے پہلے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ عرش اتنی بلندی پر واقع ہے کہ اس سے زیادہ بلندی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرے اس اساطیری روایت کو سامنے رکھنا ہوگا کہ زمین تحت الثریٰ میں مچھلی کی پیٹھ پر قائم ہے۔ کیونکہ شعر کی بنیاد یہی دونوں تصورات ہیں۔

مومن نے یہ شعر حمد میں لکھا ہے اور کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ تیری حمد و توصیف میرے امکان سے باہر ہے لیکن اس کا اظہار انہوں نے اس طرح کیا ہے کہ ہر چند میرا اپنے فکر بامِ عرش تک پہنچ گیا تھا۔ لیکن آخر کار وہاں جم نہ سکا اور جب وہاں سے پھسل کر نیچے آیا تو تحت الثریٰ کی پشتِ ماہی تک پہنچ گیا اور اس کے کانٹوں سے اپنی آبلہ پائی کو نہ بچا سکا۔

عرفی نے بھی بہ سلسلۂ حمد اپنی فکر کی نارسائی کا ذکر ایک جگہ اس انداز سے کیا ہے:—

من کہ باشم عقل کل را ناوک انداز ادب
مرغ اوصاف تو از اوجِ بیاں انداختہ

اور ممکن ہے کہ مومن نے اسی سے متاثر ہو کر یہ شعر لکھا ہو۔ پھر اس میں شک نہیں کہ عرفی نے بھی انتہائی مبالغہ سے کام لیا ہے۔ لیکن اس مبالغہ کے بوجھ کو فارسی زبان سنبھال لے گئی اور مومن کا مبالغہ حد درجہ تکلف و آورد ہو کر رہ گیا۔ کیونکہ اردو زبان اس انداز بیان کی متحمل نہ ہو سکتی تھی۔

اس غزل کے چند اور اشعار اسی انداز کے ملاحظہ ہوں:—

سرشکِ اعترافِ عجز نے الماس ریزی کی
جگر صد پارہ ہے اندیشۂ خوں گشتہ طاقت کا

"اندیشۂ خوں گشتہ طاقت" یعنی فکر و خیال کی وہ قوت جو سعیِ حمد میں خون ہو چکی ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ اعترافِ عجز کے اشکوں نے الماس ریزی کر کے میرے جگر کو اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

نہ یہ دستِ جنوں ہے اور نہ وہ جیبِ جنوں کیشاں
کہ ہو دستِ مژہ سے چاک پردہ چشمِ حیرت کا

یعنی نہ دستِ مژہ دستِ جنوں ہے اور نہ پردۂ چشمِ حیرت جیبِ جنوں کیشاں، اس لئے میری حیرت کا پردہ چاک ہونا ممکن نہیں اور میری حیرانی کبھی دور نہیں ہو سکتی۔

گلوئے خامہ میں سرمہ مداد دودۂ دل ہے
مگر لکھنا ہے وصفِ خاتمِ جلدِ رسالت کا

"مداد دودۂ دل" (دل کے دھوئیں کی سیاہی) دودہ عربی میں چھوٹے کیڑے کو کہتے ہیں۔ فارسی میں دود (دخان یا دھوئیں کو کہتے ہیں) مومن نے دود کی جگہ دودہ لکھا ہے۔

جس میں غالباً ہائے ہوز زائد ہے۔ وصف خاتمہ جلد رسالت ۔ (خاتم الانبیاء کا وصف) مفہوم یہ ہے کہ وصف خاتم الانبیاء لکھنے سے میں عاجز ہوں۔ کیونکہ میرے دل کے دھوئیں کی سیاہی گلوئے خامہ کے لئے سرمہ ہو گئی ہے اور اب اس سے کوئی آواز پیدا نہیں ہو سکتی (سرمہ کھا لینے سے گلا بیٹھ جاتا ہے)۔

نہ پوچھو گرمیٔ شوقِ ثنا کی آتش افروزی　　بنا جاتا ہے دستِ عجز شعلہ شمع فکرت کا

اظہارِ شوقِ ثنا کی آتش افروزی کا یہ عالم ہے کہ میرا دست عجز شمع فکر کا شعلہ ہو کر رہ گیا ہے۔ یعنی اس خیال نے کہ میں حمد و ثنا سے عاجز ہوں مجھے آتش بجاں کر رکھا ہے۔ تکلف و آورد کی بڑی نامطبوع مثال ہے۔

نمک تھا بختِ شورِ فکر خونِ مدح شیریں پر　　کہ دندانِ طمع نے خوں کیا ہے دست حسرت کا

دست حسرت، مدح کے خوانِ شیریں تک نہ پہنچ سکا۔ جس پر میری فکر نمک شور کی حیثیت رکھتی تھی اور اس نارسائی پر دندانِ طمع نے کاٹ کاٹ کر دستِ حسرت کا خون کر دیا۔ (حسرت و تاسف میں دانتوں سے ہاتھ کاٹنا بہت معروف بات ہے) مقصود صرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ مدح کی ناکام کوشش نے میری حسرتوں کا خون کر دیا۔

آپ نے دیکھا کہ ان تمام اشعار میں تقریباً ایک ہی خیال کو ظاہر کیا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ میں حمد و نعت کے فرض سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا اور اسی احساس نے مجھے حد درجہ مایوس و مضطرب کر رکھا ہے۔ لیکن اس کو ظاہر کیا ہے ایسے ناپسندیدہ، مبالغے کے ساتھ جس کا جذبہ و تاثر سے کوئی تعلق نہیں اور اشعار محض الفاظ کی بازیگری ہو کر رہ گئے ہیں!

چونکہ مومن کے عہد میں شاعری نے ایک ایسے فن کی صورت اختیار کر لی تھی جس کا مقصود زیادہ تر فارسی دانی اور جودت ذہن کا اظہار تھا۔ اور سادگی سے کوئی بات کہہ دینا خلاف شان سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے قصیدہ کے ساتھ ساتھ جو اس کا اظہار مشیخت کے لئے مخصوص تھا۔ غزل گوئی بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ پھر چونکہ مومن و غالب دونوں اس عہد کے بہت پڑھے لکھے اور غیر معمولی ذہن رسا رکھنے والے شاعر تھے۔ اس لئے ممکن نہ تھا کہ اپنی بلند فکری ظاہر کرنے کے لئے قصاید کے ساتھ ساتھ ان کی غزلوں میں بھی یہی رنگ شامل نہ ہو جاتا جس نے بعض اشعار کو بالکل معمہ و چیستان بنا دیا۔

سچ پوچھئے تو اس نوع کے اشعار کا تعلق شاعری سے تھا ہی نہیں بلکہ محض بازیگری سے تھا اور وہ بھی گھٹیا قسم کی جو کوہ کندن و کاہ برآوردن سے زیادہ کوئی حیثیت نہ رکھتی تھی۔

اس وقت میرا مقصود مومن کے اس رنگِ شاعری پر کوئی تفصیلی گفتگو کرنا نہیں ہے بلکہ اجمالاً صرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ جو رنگ ان کی نظر میں داخل "ہنر بندی" ہے وہ میری نظر میں یکسر نا ہنر مندی ہے۔

میں مومن کے تغزل کا بڑا معترف ہوں۔ لیکن اس کا تعلق ہنر والے مومن سے نہیں بلکہ اس بے ہنر مومن سے ہے جس نے غزل کو ان نغموں سے مالا مال کیا۔

پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہے　　اس کا نہ دیکھنا نگہ التفات ہے

کثرتِ سجدہ سے وہ نقشِ قدم　　کہیں پامالِ سر نہ ہو جائے

ہے نگاہ لطف دشمن پر تو بندہ جائے ہے　　یہ ستم اے بے مروت کس سے دیکھا جائے ہے

جاں نہ کھا وصل عدو سچ ہی سہی پر کیا کروں　　جب گلہ کرتا ہوں ہمدم وہ قسم کھا جائے ہے

سلاطین دہلی اور مغل بادشاہوں کے کھانے

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

سلاطین دہلی اور مغل بادشاہوں کے یہاں جب کوئی دعوت ہوتی تو ان کے دسترخوان پر انواع و اقسام کے کھانے ہوتے امیر خسرو نے قران السعدین میں بغراخاں (بنگال کے حکمراں) اور سلطان کیقباد (دہلی) کی ملاقات کے وقت ایک دعوت کی جو تفصیل لکھی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہی دعوتوں میں ایک ہزار سے زیادہ اقسام کے کھانے ہوتے، شربت قند کے سینکڑوں پیالے رکھے جاتے منھ کا مزہ بدلنے کے لئے شربت گلاب ہوتا۔ پلاؤ کی کئی قسمیں ہوتیں۔ ایک قسم کا پلاؤ وہ ہوتا جس میں خرمے اور انگور ڈالے جاتے۔ بکرے، دنبے اور ہرن کے بھنے ہوئے گوشت کی مختلف شکلیں ہوتیں۔ پرندوں میں بیٹر، تیتر، تیہو، اور چرز وغیرہ کے بھی گوشت ہوتے اور آخر میں پان تقسیم کیا جاتا۔

سلطان محمد تغلق کے شاہی مطبخ میں دو طرح کا کھانا پکتا۔ ایک خاص اور دوسرا عام۔ خاص کھانے میں بادشاہ کے ساتھ صرف امرا ۱۶ یا ۱۷ خاص بیرونی مہمان ہوتے۔ سلطان جب دسترخوان پر کسی کی طرف توجہ کرتا تو خود رکابی اٹھاتا اور اس میں ایک روٹی رکھکر اپنے ہاتھ سے اس شخص کو دیتا۔ وہ شخص بائیں ہتھیلی پر رکابی لے لیتا اور داہنے ہاتھ سے سلام کرتا۔ کبھی یہ خاصہ باہر بھی بھیجا جاتا۔ عام دسترخوان پر کھانا مطبخ سے لایا جاتا تو اس کے آگے نقیب النقباء رہتا۔ اس کے ہاتھ میں سونے اور اس کے نائب کے ہاتھ میں چاندی کی چھڑی ہوتی۔ جب وہ چوتھے دروازہ سے داخل ہوتے تو دیوان خانے کے تمام لوگ کھڑے ہو جاتے صرف سلطان بیٹھا رہتا۔ جب کھانا زمین پر رکھا جاتا تو نقیب صف باندھ کر کھڑے ہوتے۔ ان کا سردار سب کے آگے کھڑا ہو کر سلطان کی تعریف کرتا۔ اس وقت جو شخص جہاں ہوتا چپ چاپ کھڑا ہو جاتا کسی کو حرکت کرنے کی اجازت نہ ہوتی۔ نقیب کا نائب بھی اسی طرح تعریف کرتا۔ پھر سب زمین بوسی کر کے بیٹھ جاتے متصدی سب حاضرین کے نام لکھ لیتا۔ سلطان کا کوئی شاہزادہ ناموں کی فہرست اس کے پاس لے جاتا۔ اس کو دیکھ کر سلطان کسی امیر کو کھانا کھلانے کی خدمت انجام دینے کا حکم دیتا۔ کھانے میں عموماً چپاتیاں، بھنے ہوئے گوشت، مرغ اور سموسے ہوتے۔ دسترخوان کے صدر میں قاضی، خطیب، فقیہ، سادات اور مشائخ ہوتے۔ ان کے بعد سلطان کے رشتہ دار اور امرا ترتیب وار بیٹھتے۔ ہر شخص کی جگہ مقرر ہوتی۔ جب سب لوگ بیٹھ جاتے تو شربت دار آتے۔ ان کے ہاتھوں میں سونے، چاندی، تانبے اور کانچ کے پیالے ہوتے جن میں شربت ہوتا۔ کھانے سے پہلے شرکا شربت پیتے۔ جب وہ پی لیتے تو حاجب بسم اللہ کہتا اس وقت کھانا شروع کیا جاتا۔ ہر شخص کے سامنے ہر قسم کے کھانے کے علاوہ ایک رکابی موجود ہوتی۔ لوگ علیحدہ علیحدہ رکابیوں میں کھاتے۔ کھانے کے بعد فقاع یعنی نبیذ پیالوں میں لائی جاتی اور جب حاجب بسم اللہ کہتا تو لوگ اس کو پینا شروع کر دیتے۔ اس کے بعد پان اور چھالیہ تقسیم کی جاتی۔ ہر ایک آدمی کو چھالیہ کے ساتھ پان کے پندرہ بیڑے دیئے جاتے جس پر سرخ ریشم کا دھاگہ بندھا رہتا۔ جب پان تقسیم ہو جاتا تو حاجب پھر بسم اللہ کہتے اور سب کھڑے ہو جاتے۔ جو امیر کھانا کھلانے پر مامور ہوتا وہ زمین بوسی کرتا۔ اس کے بعد تمام شرکا اسی طرح زمین بوسی کر کے رخصت

قران السعدین علیگڑھ ایڈیشن صفحہ ۸۳-۸۶

ہو جاتے۔ اس طرح کا کھانا دو دفعہ ہوتا ایک تو ظہر سے پہلے اور دوسرا عصر کے بعد

مسالک الابصار کا مصنف شیخ مبارک کی زبانی لکھتا ہے کہ سلطان ہر روز دو دفعہ اجلاس کرتا، ایک صبح کو دوسرا شام کو۔ اجلاس کے ہونے کے بعد عام دسترخوان بچھائے جاتے۔ اس پر تقریباً تیس ہزار آدمی کھانا کھاتے۔ سلطان کے ساتھ خاص دسترخوان پر دو سو علماء و فضلاء شریک ہوتے اور اس وقت علمی گفتگو ہوتی۔ مسالک الابصار کے مصنف نے شیخ ابوبکر بن خلال بزی کی زبانی لکھا ہے کہ سلطان کے مطبخ کیلئے روزانہ ڈھائی ہزار بیل۔ دو ہزار بکریاں اور بھیڑیں ذبح ہوا کرتی تھیں۔

ابن بطوطہ سلطان محمد تغلق کی والدہ کے محل میں ایک دعوت میں شریک ہوا تھا۔ وہ اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ جب ہم محل میں داخل ہوئے تو ہم کو ایک دالان میں بیٹھنے کا حکم ہوا۔ اس کے بعد کھانا آیا۔ اسی کے ساتھ طلائی تشتے بھی آئے جو دیگوں کے مانند تھے۔ ان کی کھڑکیاں بھی تھیں جن کو سبوکہ کہتے طلائی تھیں۔ پھر پیالے، رکابیاں اور لوٹے لائے گئے۔ جو سب سونے کے تھے۔ دسترخوان بچھائے گئے تو دو دو صفیں تھیں۔ سب سے پہلے شیخ بیٹھتا جو مہمانوں میں سب سے زیادہ ممتاز ہوتا۔ جب ہم کھانے کے واسطے آگے بڑھے تو حاجیوں اور نقیبوں نے تعظیم کی۔ ہم نے بھی تعظیم کی پہلے شربت لایا گیا۔ جب ہم شربت پی چکے تو حاجیوں نے بسم اللہ کہا۔ اس وقت ہم نے کھانا شروع کیا۔ جب کھانا کھا چکے تو نبیذ کا دور چلا۔ اس کے بعد پان تقسیم ہوتے۔ پھر حاجیوں نے بسم اللہ کہا۔ ہم سب نے تعظیم کی۔ اس کے بعد ایک خاص جگہ جا کر بیٹھے جہاں ہم کو زربفت کے خلعت دیئے گئے۔ پھر ہم محل کے دروازے پر آئے۔ وہاں پہنچ کر ہم سب نے پھر تعظیم کی۔ حاجیوں نے پھر بسم اللہ کہا تو وزیر ٹھہر گیا۔ ہم سب بھی ٹھہر گئے۔ محل کے اندر سے ریشم، کتان اور سوتی تھان آئے۔ جو ہم میں سے ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ حصوں میں دیئے گئے۔ اس کے بعد طلائی سینی آئی۔ جس میں خشک میوے تھے۔ دوسری سینی میں گلاب اور تیسری میں پان تھے۔ اس ملک میں دستور ہے کہ جس کے واسطے یہ چیزیں سینی میں لائی جاتی ہیں تو وہ سینی کو ہاتھ میں لیتا ہے اس کو اپنے ایک ہاتھ پر رکھ کر دوسرے ہاتھ سے زمین کو چھوتا ہے۔ وزیر نے سینی کو اپنے ہاتھ میں لے کر مجھ کو بتایا کہ میں کس طرح سینی کو لوں۔ پھر میں نے بھی اسی طرح کیا۔ اس کے بعد ہم سب اپنی قیام گاہ پر واپس آئے[1]

کبھی ایسا بھی ہوتا کہ سلطان کھانے پینے کی چیزیں اپنے خاص مہمانوں کے پاس بھجوا دیتا تاکہ وہ اپنی خواہش کے مطابق پکوا کر خرچ کریں ایک بار ابن بطوطہ سلطان محمد تغلق کے محل میں بھی گیا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ میں سلطان کے محل میں گیا تو پہلے وزیر کو جا کر سلام کیا۔ اس نے مجھ کو ہزار ہزار کی دو تھیلیاں دیں اور کہا یہ میرے سر شوئی (سر دھونے) کے لئے ہیں۔ اس کے بعد ایک ریشمی خلعت دیا۔ میرے ساتھ کچھ ہمراہی غلام اور خادم بھی تھے۔ وزیر نے ان سب کے نام لکھے اور ان کے چار درجے مقرر کئے۔ پہلے درجہ والوں کو دو دو سو دوسرے کو ڈیڑھ ڈیڑھ سو تیسرے کو سو سو اور چوتھے کو پچھتر پچھتر دینار ملے۔ اس کے بعد سلطان کی طرف سے ضیافت کا حکم ہوا۔ اس کے لئے ایک ہزار رطل آٹا اور ایک ہزار رطل گوشت آیا۔ آٹا ایک ثلث نومیدہ تھا اور باقی دو ثلث بغیر چھنا ہوا تھا۔ گھی، چینی اور چھالیہ بھی کئی کئی رطل تھیں۔ ہزار ورق پان کے بھی تھے[2]

(اس زمانہ میں ایک رطل چودہ سیر کے برابر ہوتا تھا)

سکندر لودی رات کا کھانا علماء و فضلاء کی موجودگی میں کھاتا۔ اس کی خواب گاہ میں مسہری کے پاس دسترخوان لگتا۔ انواع و اقسام کے کھانے چنے جاتے تھے علماء و فضلاء کے سامنے بھی کھانا لگایا جاتا لیکن وہ اس وقت کھاتے جب سلطان کھا لیتا تو ان کے سارے کھانے ان کے گھروں پر بھیج دیتے جاتے اور وہیں کھاتے[3]

سلطان دہلی کے مطبخ کا نگراں ان اعلیٰ چاشنی گیر کہلاتا۔ اس کے نائب، نائب چاشنی گیر کہلاتے۔ پانی اور دیگر مشروبات کا مہتمم شرب دار کہلاتا۔

اکبر کے زمانے میں محل کے اندر تین قسم کے کھانے پکتے (۱) صوفیانہ جس میں گوشت نہ ہوتا (۲) گوشت یا بریخ جس میں چاول اور گوشت دونوں ملے ہوتے (۳) آب زیر جس میں مسالہ کے ساتھ گوشت پکتا۔ اکبر ہر جمعہ، اتوار، روز تحویل (سال شمسی کا پہلا دن) روز مہر (چاند اور سورج کے گرہن کے دن) رجب

---

[1] سفرنامہ ابن بطوطہ اردو ترجمہ ص ۲۰۶-۲۰۴ [2] سفرنامہ ابن بطوطہ اردو ترجمہ ص ۲۰۷

کے پہلے دوشنبہ اور تخت نشینی کے دن صوفیانہ کھانا کھایا کرتا تھا۔ ان مقررہ دنوں میں جانور ذبح نہیں کئے جاتے تھے۔ جہانگیر کو کالے تیتر کا گوشت زیادہ پسند تھا۔ وہ پودنہ کا گوشت بھی شوق سے کھاتا۔ بھیڑ سے زیادہ نیار حلوان کے گوشت کو پسند کرتا۔ مچھلیوں میں رو ہو کھاتا یا پھر اس کو وہ مچھلیاں پسند تھیں۔ جن کے ڈینے ہوتے۔ نورجہاں کے آنے کے بعد شاہی محل کے کھانوں میں ایرانی اثرات کی وجہ سے لطافت اور نفاست زیادہ بڑھ گئی اور شاہ جہاں کے زمانے میں وہ انتہا تک پہنچ گئی۔ اورنگ زیب کا کھانا سادہ ہوتا۔ وہ عموماً کھچڑی بریانی اور قبولی زیادہ کھاتا۔ لیکن اس کے عہد میں بھی جب کبھی اس کیطرف سے دعوت ہوتی تو اس کا پورا اہتمام کیا جاتا۔ اس کے عہد میں ایران سے ایک سفیر آیا تو اس کے اعزاز میں لاہور میں ایک دعوت کی گئی۔ کھانے میں چار سو قابیں تھیں۔ فواکہات اور عطریات کے سات سو خوان تھے[1]۔ شاہی دسترخوان بچھتا تو پہلے گلاب چھڑکا جاتا۔ پھر کیوڑہ، پھر عطر حسن یا کوئی اور عطر۔ مغلوں کی حکومت کے آخری دور میں قلعہ معلیٰ کے اندر دسترخوان پر اتنی قسموں کے کھانے لگائے جاتے کہ ان کی گنتی ممکن نہ ہوتی۔

بہادر شاہ ظفر کے دسترخوان کے آداب یہ تھے سب سے نیچے چمڑا، چمڑے پر سٹیل پائیان، سٹیل پائیوں پر بیچ میں چار گز لمبا اور آدھ گز بلند تخت اور اس کے چاروں طرف پر تکلف دسترخوان۔ بادشاہ تخت پر آکر بیٹھتا۔ اس کے دائیں طرف بیگمیں، بائیں طرف شہزادیاں، سامنے مرد اور لڑکے ہوتے سیلاچی پہلے بہادر شاہ ظفر کے سامنے آتی۔ اس کے بعد دائیں طرف سے سلسلہ شروع ہوتا۔ شاہی سیلاچی میں صرف بیگمیں ہاتھ دھوتیں۔ دوسری سیلاچی میں شہزادیاں اور تیسری میں مرد ہاتھ دھوتے۔ کھانے سے پہلے گلاب پاش سے چاروں طرف گلاب چھڑکا جاتا۔ اس کے بعد عطریات کا چھڑکاؤ ہوتا۔ بادشاہ کسی کھانے کی طرف ہاتھ بڑھاتا تو چوبدار طعام مبارک کی آواز بلند کرتا۔ کھاتے وقت کسی کو بولنے کی اجازت نہ تھی۔ اور جب بادشاہ کسی کو کوئی خاص کھانا مرحمت کرنا چاہتا تو وہ بچہ ہو یا جوان، عورت ہو یا مرد، اپنی جگہ سے اٹھ کر جائے ادب پر جاتا اور جھک کر تین سلام بجا لاتا۔ بہادر شاہ کا ہاتھ رک جاتا تو سب شرکاء ہاتھ روک لیتے لیکن خود بادشاہ ہاتھ اس وقت تک نہ روکتا۔ جب تک کہ اس کو یہ اطمینان نہ ہو جاتا کہ تمام شرکا سیر ہو کر کھا چکے ہیں۔ کوئی پانی مانگتا تو چاندی کی صراحی سے پانی سونے کے کٹورے میں انڈیلا جاتا، اور کٹورہ کو سنہری طشتری میں رکھ کر پیش کیا جاتا۔ کھانا کھانے کے بعد بہادر شاہ کے ہاتھ بارگاہ الٰہی میں شکرانے کے لئے اٹھ جاتے۔ اس کے تمام شرکا بھی ہاتھ اٹھاتے۔ پھر سیلاچی بدستور سابق سب کے سامنے آتی۔ ابٹنہ، کھلی، بیسن، اور صابن سے ہاتھ دھوئے جاتے ہاتھ صاف کرنے کے لئے رومال بہ کثرت موجود ہوتے۔ کھانے کے بعد بہادر شاہ ظفر کے سامنے سونے کی طشتری میں سونے کا خلال پیش ہوتا۔ بیگمات پاندان کھول کر گلوریاں بنانے میں لگ جاتیں۔ دسترخوان پر کھانا بہت بچ جاتا۔ اسی میں سے بہادر شاہ جس کو کہتے اس کے پاس خاصہ بھیجا جاتا

بادشاہوں کی تقلید میں امرا بھی اپنا دسترخوان اسی شان سے سجاتے۔ امیر خسرو کے نانا عماد الملک سلاطین دہلی کے عہد میں میر عرض کے عہدے پر مامور رہے۔ وہ اپنے ماتحتوں اور ملازموں کو روزانہ کھانا کھلاتے تھے۔ ان کے لئے پچاس طشت بہترین کھانے کے آتے۔ عہد تغلق کے ایک امیر خراسانی زادہ توام الدین کی ایک ضیافت میں ابن بطوطہ ملتان میں شریک ہوا تھا۔ اسی سلسلہ میں وہ اس زمانے میں دعوتوں کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ پہلے روٹیاں لاتے ہیں جو نہایت پتلی ہوتی ہیں۔ پھر مسلم بھنی ہوئی بکریاں لاتے ہیں۔ ہر ایک کے چار یا چھ ٹکڑے کر کے ایک ایک آدمی کے سامنے رکھتے جاتے ہیں۔ پھر گھی میں تلی ہوئی روٹیاں آتی ہیں۔ جن کے جوف میں حلوہ صابونیہ بھرا ہوا ہوتا ہے اور ہر ایک ٹکیہ کے اوپر ایک میٹھی روٹی ہوتی ہے جس کو خشتی کہتے ہیں یہ آٹے، شکر اور گھی سے بنتی ہے۔ پھر ایک خاص چیز لاتے ہیں جس کو سموسہ کہتے ہیں۔ وہ قیمہ کیا ہوا گوشت ہوتا ہے اس میں بادام جائفل، پستہ، پیاز اور گرم مسالہ ڈال کر پتلی چپاتیوں میں لپیٹ دیتے ہیں۔ اور پھر گھی میں تل لیتے ہیں۔ ہر ایک شخص کے سامنے پانچ یا چھ سموسے رکھے جاتے ہیں۔ پھر گھی میں پکے ہوئے چاول لاتے ہیں۔ اس کے اوپر مرغ ہوتا ہے۔ پھر نقیبات القاضی لاتے ہیں، جس کو ہاشمی کہتے ہیں۔ پھر قاہریہ لاتے ہیں ..... کھانا شروع کرنے سے پہلے چاندی، سونے اور کانچ کے پیالوں میں سکنجبین اور گلاب کا شربت پیتے ہیں۔ جب شربت پی لیتے ہیں تو سب بسم اللہ کہہ کر کھانا شروع کرتے ہیں۔ کھانا ختم ہونے پر فقاع (یعنی بنبذ) کے پیالے آتے ہیں۔ اور جب اس کو پی لیتے ہیں۔ تو پان آتا ہے۔ چھالیہ کے ساتھ

---

[1] عالم گیر نامہ ۶۰۷-۶۰۴

پان لینے کے بعد سب اٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ اگر کسی دعوت میں سلطان بھی ہوتا ہے تو کھانے سے پہلے اس کی تعظیم کرتے ہیں۔ اس طرح کہ سر کو رکوع کی طرح نیچے جھکاتے ہیں اور رخصت ہوتے وقت بھی یہی تعظیم بجا لاتے ہیں[1]

عہد مغلیہ میں امرا کا دسترخوان اور بھی پر تکلف ہو گیا تھا۔ اکبر کے وزیر ابوالفضل کے دسترخوان پر طرح طرح کی چیزیں ہوتیں۔ وہ خود بھی اکبری دن سے بائیس سیر کھانا ایک وقت میں تنہا کھاتا تھا[2] ماثر الامراء کی بس اتنی روایت ہے۔ لیکن مولانا محمد حسین دربار اکبری میں اپنے خاص انداز میں لکھتے ہیں کہ شیخ ابوالفضل کے کھانے کا حال سن کر تعجب آتا ہے۔ بائیس سیر کے اجناس کی مختلف چیزیں مختلف رنگوں سے پک کر دسترخوان پہ لگتی تھیں۔ ابوالفضل کا لڑکا عبدالرحمٰن پاس بیٹھتا تھا اور خانساماں کی طرح دیکھتا رہتا تھا۔ خانساماں بھی سامنے حاضر رہتا۔ دونوں خیال رکھتے تھے کہ ہر رکابی سے دو تین یا کئی نوالے کھائے جائیں۔ جس کھانے کو صرف ایک ہی دفعہ کھایا اور چھوڑ دیا وہ دوسرے وقت دسترخوان پر نہ آتا کسی کھانے میں آب و نمک کا فرق ہوتا تو شیخ صرف اشارہ کر دیتا۔ منہ سے کچھ نہ کہتا۔ خانساماں کو دے دیا جاتا وہ اس کا تدارک کرتا۔ جب شیخ دکن کی مہم پر تھا۔ دسترخوان وسیع اور کھانا کھاتے تھے۔ بادرچی کھانا برابر گرم رکھتا تھا اور کھچڑی کی دیگیں ہر وقت چڑھی رہتی تھی۔ جو بھوکا آتا رزق پاتا اور کھاتا تھا۔

جہانگیری عہد کے ایک فوجی سردار باقر خاں نجم ثانی کے بادرچی خانے کے لئے دو سو بکرے، چالیس اونٹ اور ایک ہزار دوسرے جانور ذبح ہوتے تھے[3]۔ شاہ جہاں کا خسر معین الدولہ آصف خاں دن رات میں شاہ جہانی تول سے ایک من وزن کا کھانا کھایا کرتا تھا[4]۔ اس کے لڑکے اعتقاد خاں کے یہاں کھانوں کے اتنے اقسام ہوتے کہ کوئی اور امیر اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا[5]

امرا جب بادشاہ کو اپنے یہاں مدعو کرتے تو وہی شان و شوکت دکھاتے۔ جو درباروں میں ہوا کرتی تھی۔ اعتماد الدولہ نے جہانگیر کو چودھویں سال جلوس جشن نوروز کے موقع پہ اپنے یہاں مدعو کیا تو جہانگیر کی رہ گذر کو طرح طرح کے فانوس سے روشن کیا اور جو نذرانے پیش کئے ان میں سونے کا ایک تخت بھی تھا۔ جو تین سال کی مدت میں ساڑھے چار لاکھ روپے میں تیار ہوا تھا[6]۔

عہد جہانگیری میں آصف خاں (نور جہاں کے بھائی) نے برطانوی سفیر کو جو دعوت دی اس کا ذکر ایڈورڈ ٹیری نے بڑی تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ آصف خاں نے سفیر کی دعوت ایک بہت بڑے اور خوبصورت خیمہ میں کی۔ وہاں میرے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ خیمہ ایسی خوشگوار قسم کی خوشبویات سے معطر کیا گیا تھا۔ جو بادشاہوں اور امیروں کو مرغوب ہوا کرتی تھیں۔ خیمے کے اندر بڑے قیمتی قالین بچھے تھے۔ اور جہاں کھانا چنا گیا تھا۔ وہاں پر اور بھی عمدہ قالین بچھائے گئے تھے۔ ان کے اوپر اعلیٰ قسم کے بوٹے دار سفید دسترخوان تھے۔ ان پر چاندی کے ظروف رکھے تھے جن کے حاشیے سونے کے بنے ہوئے تھے۔ یہ ظروف ہماری ان بڑی سی بڑی پلیٹوں سے بڑے نہ تھے۔ جن میں نان پاؤ رکھ کر کاٹے جاتے ہیں۔ ہم لوگ ایک مثلث کی شکل میں بیٹھے۔ سفیر آصف خاں کے دائیں جانب تھوڑی دور پر بیٹھا اور میں ان دونوں کے سامنے تھا۔ ہم سب زمین ہی پر بیٹھے کیونکہ یہاں لوگ اسی طرح کھانا کھاتے ہیں۔ ہمارے چہرے ایک دوسرے کے سامنے تھے۔ اور ہم سب کے کھانے علیحدہ تھے۔ سفیر کے کھانوں میں دس قسم کے کھانے میزبان سے زیادہ تھے۔ میرے کھانے میں دس قسم کی چیزیں میزبان سے کم تھیں۔ پھر بھی میرے سامنے پچاس قسم کے کھانے تھے ۔۔۔ میں نے ان سب کو چکھا۔ سب کا ذائقہ بہت ہی عمدہ تھا۔ بڑی قابوں میں مختلف قسم کے چاول تھے۔ جن کا رنگ سفید بھی تھا، زعفرانی بھی، سبز بھی، روغنی بھی۔ یہ کسطرح پکائے گئے تھے۔ یہ تو میں نہیں بتا سکتا۔ لیکن بہت ہی مزے دار تھے۔ کھانے میں گوشت کی بھی کئی قسمیں تھیں۔ مرغ اور پرندوں کے گوشت کاٹ کاٹ کر ہندوستانی طرز پر پکائے گئے تھے۔ میٹھی اور ترش چیزیں بھی تھیں۔ چاول کی فیرنی بہت میٹھی چیز تھی۔ اس میں میٹھے بادام بہت ہی باریک تراش کر کے ڈالے گئے تھے۔ اور اس میں مرغ کے گوشت کے ٹکڑے بھی ملے تھے جن

---

[1] سفرنامہ ابن بطوطہ مترجمہ اردو ص ۲۶۔۲۷ [2] ماثر الامراء جلد اول ص ۴۸۴ [3] ماثر الامراء جلد اول ص ۴۸۸ [4] ماثر الامراء ص ۱۵۸

یز کرنا آسان نہ تھا۔ ان میں کیوڑے کے عرق کے ساتھ عنبر بھی تھا۔ طرح طرح کی روٹیاں بھی تھیں بعض میں بادام اور قند ملے تھے۔ بعض
ت ہی خوشبودار تھیں، آلو کی بھی عمدہ چیزیں تھیں مختلف قسم کے پھل بھی تھے بادام کشمش اور آلو بخارا کی چیزیں بھی تھیں اور پھر معلوم نہیں
یا تھا۔ غرضیکہ یہ ضیافت عمدہ سے عمدہ تھی روٹیاں بہت اچھے گیہوں کی تھیں، سفید ہلکی اور گول بھی ... پانی سادہ تھا۔ ہم لوگ بہت
یک اس ضیافت میں رہے۔ یہ روم کے مشہور اپی کیور کی دعوت سے یقینی بہتر کہی جاسکتی ہے جو اپنی بھوک کو رفع کرنیکی خاطر زمین، ہوا اور
مدر کی تمام چیزیں فراہم کرنے کا عادی تھا[1]

آصف خاں اپنے محل میں بلاکر بادشاہ شہزادوں اور شہزادیوں کی ضیافت کرتا تو ان کے استقبال اور دعوت میں جتنا تکلف اور
تمام ممکن ہو سکتا تھا وہ کیا کرتا تھا۔ اسی زمانہ میں ایک فرنگی سیاح ف۔ س۔ مندیلسلو آیا تھا اس کا بیان ہے کہ اس نے آصف خاں کے پہرے
روں کی سازش سے اس محل کے اندر چھپ کر ایک ضیافت کو دیکھنے کی کوشش کی۔ اس کا بیان ہے کہ آصف خاں نے شاہجہاں کو
نے زنانخانہ میں مدعو کیا تو جس ایوان میں اس نے یہ دعوت کی اس کو فرش فروش اور زرنگار قالین سے آراستہ کیا چاندی کی انگیٹھیوں
ں جابجا عنبر اور دوسری خوشبودار چیزیں جلائی جارہی تھیں جن سے تمام فضا معطر تھی۔ مرصع اور زریں ظروف سے پورا ایوان جگمگا رہا
ھا ایوان میں جسطرف داخلہ کا راستہ تھا وہاں چاندی کی ایک بڑی مچھلی آویزاں تھی۔ اس کے منہ سے سات معطر فوارے چھوٹ رہے تھے
ج میں دسترخوان بچھے تھے جو باریک اور مہین سوتی کپڑے کے تھے ان پر قدرتی خوشبودار پھولوں کے گلدستوں کے بجائے نقرئی اور
لائی پھول کڑھے تھے ایک نمایاں جگہ پر دو طلائی مسندیں بچھی تھیں ان کے پاس جابجا نقرئی مسندیں بھی تھیں جب شاہجہاں ایوان
ں داخل ہوا تو بغل کے کمروں سے سرود و نغمہ کی آواز بلند ہوئی۔ شاہجہاں کے آگے آگے شہزادیاں تھیں جو طلائی اور نقرئی کام سے
ے ہوئے زرق برق لباس پہنے تھیں ان کے گلوں اور سروں پر سونے اور موتیوں کے ہار جگمگا رہے تھے شاہجہاں اندر داخل ہوا تو
ائیں طرف اسکی خوش دامن اور بائیں طرف اسکی چہیتی بیگم ممتاز محل تھیں خود بیچ میں تھا اس کے پیچھے دارا شکوہ اور آصف خاں تھے شاہجہاں
رنگا مسند پر آکر بیٹھ گیا۔ اس کے بیٹھتے ہی دو حسین عورتیں مورچھل ہلانے لگیں اس کے فوراً ہی بعد آصف خاں کے گھر والے اور خود شاہجہاں
کے شہزادے شہزادیاں آگے بڑھیں اور جھک کر کورنش اور چہار تسلیمات بجالائیں شاہجہاں اپنی خوش دامن سے بڑی تواضع کے ساتھ پیش آیا، اسے
پنی دائیں جانب بٹھایا اور دوسروں کو بھی بیٹے کو کہا پہلی اور دوسری بار کہنے پر وہ سب کھڑے رہے لیکن تیسری بار ان سے کہا گیا تو وہ مؤدب بیٹھ
گئے ان کے بیٹھتے ہی بہت ہی شیریں نغموں کی آواز آنی شروع ہوئی۔ ان نغموں میں بادشاہ کے جنگی کارنامے بیان کئے جارہے تھے دست شوئی کا اہتمام شروع
ہوا تو پہلے چار حسین لڑکیاں داخل ہوئیں جو آصف خاں کے خاندان کی تھیں وہ اپنے حسن و جمال میں کسی جگہ کی بھی حسین عورتوں سے کم نہ تھیں وہ بہت ہی
مؤدب ہو کر بادشاہ کی طرف بڑھیں ان میں سے ایک نے اس کے سامنے سفید ساٹن کا ایک کپڑا بچھایا دوسری نے ایک خوب صورت طلائی سلاچی سامنے
رکھی جس میں جواہرات جڑے تھے تیسری نے اسی قسم کے طلائی برتن سے ہاتھ دھلایا چوتھی نے ہاتھ پونچھنے کے لئے تولیہ بڑھایا۔ ان چاروں کے
بعد بارہ عورتیں داخل ہوئیں جو پہلی چار لڑکیوں کی طرح معزز تو نہ تھیں لیکن تہذیب میں کم بھی نہ تھیں انھوں نے شہزادوں اور شہزادیوں کے ہاتھ
اسی طرح دھلائے جب کھانا دسترخوان سے آنا شروع ہوا تو طرح طرح کے نغمے بھی تیز ہونے لگے خواجہ سرا طلائی ظروف میں کھانا لاتے
تھے ان خواجہ سراؤں کا لباس بہت ہی اچھا اور معطر تھا۔ چار خواجہ سرا کھانا لاکر دو خواجہ سراؤں کو دیدیتے۔ پھر یہ دونوں ان دو حسین عورتوں کو جو
بادشاہ کے پاس کھڑی رہتیں یہ برتن دیدیتے یہ دونوں عورتیں گھٹنے ٹیک کر بادشاہ کے سامنے ظرف رکھتیں دسترخوان پر روٹیوں اور مٹھائیوں کی

---

[1] آزاد ترجمہ بحوالہ اکبر اعظم (AKbar, The Great Mogh ul) از وی اے۔ سمتھ ص ۴۰۵

بہت سی قسمیں تھیں، کھانے کے بعد رقص بھی ہوا، پھر نذرانے پیش ہوئے جن میں طرح طرح کے جواہرات تھے

شاہی مطبخ کے چار حصے ہوتے تھے (۱) مطبخ جہاں کھانا پکتا تھا۔ (۲) آب دار خانہ جہاں پینے کا پانی اور دوسرے مشروبات ہوتے تھے (۳) میوہ خانہ جہاں پھل رکھے جاتے تھے۔ (۴) رکاب خانہ جہاں آٹے کی چیزیں پکتی تھیں۔

مطبخ میں حسب ذیل ملازم ہوتے تھے۔ (۱) میر بکاول۔ وہ پورے مطبخ کا نگراں ہوتا اور دیوان بیوتات کی مدد سے ہر قسم کی چیزیں فراہم کرتا۔ اکبری عہد میں سکھدا اس چاول بہرا پچ، دیوزیرہ چاول گوالیار، جنجن چاول راجواری سے آتا کیوں کہ اکبر ان کو خاص طور سے پسند کرتا تھا گھی حصار فیروزہ سے منگوایا جاتا۔ تازہ مرغابیاں اور اکثر ترکاریاں کشمیر سے آتیں، بکریاں، بھیڑ، بربری، مرغ، قاز وغیرہ بھی پالے جاتے۔ مذبح شہر سے باہر تالاب کے کنارے ہوتا۔ وہاں سے گوشت کیسوں میں لایا جاتا۔ باورچیوں کی مہر کے بعد کیسے مطبخ میں بھیجے جاتے۔ یہ سب کچھ میر بکاول کی نگرانی میں ہوتا (۲) خزانچی۔ وہ ایک سال کا تخمینہ پیش کرتا جس کے بعد سال بھر کی رقم اس کو دے دی جاتی۔ روپیوں کی تھیلیوں پر میر بکاول کی مہریں ہوتی تھیں۔ اجناس پر بھی اس کی مہر ہوتی۔ خزانچی روزانہ اخراجات کی فہرست بھی میر بکاول کے سامنے پیش کرتا۔ اس کی رسید پر دو عہدیداروں کی مہریں ہوتیں (۳) خورش شناس۔ وہ کھانا چکھا کرتا (۴) تنبکچی۔ وہ تمام اخراجات لکھنے کے لئے مقرر ہوتا۔ ان کے علاوہ بکاول، باورچی رکاب دار سقے وغیرہ ہوتے۔

کھانے پکاتے وقت پکانے والے آستین چڑھا کر دامن کمر سے باندھ لیتے اور اپنا منہ اور ناک بند کر لیتے۔ کھانا پک جاتا تو اس کو پہلے بکاول، پھر چاشنی گیر اور آخر میں میر بکاول چکھتا، پھر کھانا قابوں میں نکالا جاتا۔ طلائی اور نقرئی قابیں سرخ کپڑوں اور چینی اور تانبے کے ظروف سفید کپڑوں میں باندھے جاتے۔ میر بکاول ان کپڑوں پر اپنی مہر لگا دیتا اور ہر پکی ہوئی چیز کا نام لکھ لیتا۔ باورچی خانہ کا منشی ان تمام کھانوں کی فہرست اپنے پاس رکھ لیتا۔ پھر یہ محل کے اندر بھیج دیئے جاتے۔ کھانے کی قابیں بکاول اور دوسرے ملازمین لے کر چلتے۔ چوب داران کے ساتھ ہوتے جب کھانے کی قابیں اندر پہنچ جاتیں تو پھر وہی، اچار اور لیمو وغیرہ اسی طرح مہر کر کے بھیجے جاتے۔ محل کے اندر ملازمین ان کھانوں کو چکھ لیتے تو دسترخوان پر چنتے۔ دسترخوان بچھانے والے شیلا نچی کہلاتے اور جب بادشاہ دسترخوان پر بیٹھتا پہلے فقراء کا حصہ علیحدہ کر دیا جاتا۔ تمام ملازمین آس پاس کھڑے رہتے۔ اکبر دودھ یا دہی کھا کر کھانا شروع کرتا اور جب کھانا ختم ہو جاتا تو خدا کا شکر بجا لایا جاتا۔ میر بکاول ہر وقت حاضر رہتا اور آخر میں فہرست کے مطابق برتنوں کو لے کر واپس جاتا۔

مختلف قسموں کے کھانے علیحدہ علیحدہ بکاول پکایا کرتے تھے۔ مغل بادشاہوں کے آخر دور میں کھانا پکانے والوں کی تین قسمیں ہو گئیں تھیں۔ دیگ شو، باورچی اور رکابدار۔ دیگ شو صرف دیگ اور دوسرے برتن دھویا کرتے، باورچی دیگوں میں کھانا پکایا کرتے۔ رکابدار صرف چھوٹی ہانڈیاں پکاتے اور میوہ جات کے پھول کتر کر کھانوں پر نقش و نگار بناتے۔ بادشاہ اپنے دسترخوان پر سے امرا اور خاص خاص لوگوں کو کھانے بھیجا کرتا تھا جس کو الوش خاصہ کہا جاتا تھا۔ جو امیر رات کو محل کا نگراں ہوتا اس کو بھی کھانا شاہی خاصہ سے ملتا۔ خاصہ پاتے وقت ایک خاص رسم ادا کی جاتی۔ امیر کھڑے ہو کر بادشاہ کے محل کی طرف رخ کر کے تین دفعہ تسلیمات بجا لاتا یعنی اپنا دایاں ہاتھ جھک کر زمین سے سر اٹھاتا۔ کسی تقریب کے موقع پر بادشاہ کی طرف سے مختلف لوگوں کو تورہ بھی بھیجا جاتا۔ ترکی کی زبان میں تورہ آئین اور قانون کو کہتے ہیں۔ لیکن مغل بادشاہوں کے عہد میں تورہ کھانے کے خوان کو بھی کہا جاتا خصوصاً وہ خوان جس میں شادی بیاہ کے موقع پر حصے بھیجے جاتے۔ بادشاہوں کی تقلید میں اچھی حیثیت والے لوگ بھی شادی بیاہ میں عزیزوں اور دوستوں کو تورہ بھیجتے۔ ایک تورہ ایک کہار کی ہنگی میں بھیجا جاتا۔ ہنگی پر لکڑی کا رنگین خواں ہوتا۔ خوان میں مٹی کے لاکھی برتن ہوتے جن میں عموماً حسب ذیل چیزیں ہوتیں:۔

(۱) ڈھائی سیر پختہ وزن کی دو عدد باقرخانیاں (۲) دو پیالے قورمہ ہر پیالہ میں کم سے کم آدھ سیر قورمہ ہوتا (۳) شامی کباب پانچ عدد (۴) بریانی و طباق (۶) فرنی دو پیالے ہر پیالہ میں آدھ سیر (۷) آم کا مربہ ایک پیالی (۸) کئی قسم کے چار (۹) دہی ایک پیالہ جس میں کم از کم آدھ سیر دہی ہوتا (۱۰) گاؤزبان دو عدد (۱۱) گاؤدیدہ دو عدد (۱۲) نان تنوری یعنی آبی روٹی دو سیر کی چار عدد۔ یہ سب چیزیں مانڈوں سے ڈھکی ہوتی تھیں۔ مانڈہ باریک چپاتی کو کہتے تھے۔ بادشاہوں کے یہاں کے تورے اور بھی پر تکلف ہوتے تھے۔ یہ چاندی اور چاندی کے برتنوں میں بھیجے جاتے تھے۔ ان میں کھانے کی مختلف چیزوں کی اتنی فراوانی ہوتی کہ جہاں بھیجی جاتی تھیں وہاں کا صحن بھر جاتا تھا۔

سلسلہ تفصیل کے لئے دیکھئے جوں آف دی مغل ایمپائر از ڈاکٹر عالم گیری ص ۲۵ طبع کراچی

سلسلہ تفصیل کے لئے دیکھئے جوں آف دی مغل ایمپائر از ڈاکٹر عالم گیری ص ۲۵ طبع کراچی

جگن ناتھ آزاد کا ایک خط ڈاکٹر نارنگ کے نام (عدن سے)

بحیرۂ قلزم
۱۴ر جولائی ۱۹۶۱ء

برادر عزیز

سفر کا معاملہ بھی عدن ہی جیسا تھا۔ جہاز کو بندرگاہ سے کئی فرلانگ ادھر گہرے پانی میں روکا گیا اور جن مسافروں کو سوار ہونا تھا وہ کشتیوں اور موٹر لانچوں میں بیٹھ کر جہاز تک پہنچے۔ نہ جانے ساحل حبشہ کے قریب سے گذر کر اٹلی والوں کی کیا حالت ہوتی ہوگی۔ یہاں کا چپہ چپہ ان کی ہوس ملک گیری اور ذلت آمیز شکست کی داستان سنا رہا ہے۔ ہم جس جہاز میں سفر کر رہے ہیں یہ اٹلی والوں ہی کا جہاز ہے اور اس کا سارا عملہ اطالوی ہے۔ ان لوگوں کو تو افریقہ کے ساحل کا یہ حصہ ایک داستان عبرت ہی نظر آتا ہوگا

آج صبح بہت جلد میری آنکھ کھل گئی۔ جہاز پھر ہچکولے کھا رہا تھا۔ میں ہاتھ منہ دھو کر اوپر ڈیک پر آیا تو ڈیک پر بھر مضبوط ٹاٹ کی چھت بندھی ہوئی تھی۔ سمندر کی لہروں کا پانی ہلکی بوچھار کی صورت میں ڈیک پر بھی آ رہا تھا۔ خیال ہوا شاید چار دن پہلے کا نظارہ پھر رونما ہونے والا ہے۔ نوٹس بورڈ جا کے دیکھا تو "سمندر" کے سامنے لفظ "پرسکون" لکھا تھا۔ میں حیران ہوا کہ یہ کیسا سکون ہے۔ لیکن جب سمندر پر نظر دوڑائی تو چار دن پہلے والی کیفیت نہیں تھی۔ چھوٹی بڑی لہریں کافی وقفے کے بعد اٹھ رہی تھیں۔ ہاں ہوا قدرے تیز تھی۔ اس لئے سمندر کے چھینٹے ڈیک پر بھی پڑ رہے تھے۔

سمندر آخر سمندر ہے۔ بحیرۂ قلزم ہو یا بحیرۂ روم اس میں طوفان نہ بھی ہو تب بھی کسی نہ کسی حد تک اس میں تموّج کی کیفیت تو رہتی ہی ہے۔ یہ کوئی ہم ہندوستانیوں کا دل تھوڑا ہی ہے کہ ہمیشہ بجھا ہی رہے۔

بحیرۂ قلزم جس میں ہم اس وقت گرم سفر ہیں کوئی بارہ سو میل لمبا سمندر ہے۔ اس میں کسی طرف سے کوئی دریا نہیں گرتا اور اس کے شمالی نصف حصے نے تو شاید بارش کی صورت ہی کبھی نہیں دیکھی۔ اس کے دونوں طرف پہاڑ موجود ہیں لیکن کنارے بحیثیت مجموعی پست اور ریتیلے ہیں۔ یہ سمندر پانی سے بھری ہوئی ایک وادی کی مانند ہے جس کے مشرق میں عرب کی سطح مرتفع ہے اور مغرب میں پہاڑوں کا ایک سلسلہ ہے جو چار ہزار اور چھ ہزار فٹ کی بلندی تک چلا گیا ہے۔ بحیرۂ قلزم کی گہرائی بہت زیادہ بیان کی جاتی ہے لیکن عین سمندر میں پتھر اور مونگے کی چٹانیں خاصی تعداد میں موجود ہیں جن کی بدولت گہرائی ہر جگہ ایک سی نہیں رہی۔ یہ چٹانیں عین اس راستہ پر بھی موجود ہیں جس پر سے ہو کے جہاز گذرتے ہیں۔ جنوبی حصے کی یہ چٹانیں بہ نسبت شمالی حصہ کے قدرے زیادہ محفوظ ہیں۔

اکثر اوقات بحیرۂ قلزم اور خلیج عدن کا پانی رات کو چمک اٹھتا ہے اور اس میں سے روشنی کی کرنیں پھوٹتی دکھائی دیتی ہیں یہ غالباً فاسفورس کے ان ذخیروں کا اثر ہے جو اس سمندر کی تہ میں آسائیدہ ہیں۔

[illegible] ہونے کو ہے اور ہم جس مقام سے گزر رہے ہیں اس کے مشرق میں جدہ کی بندرگاہ ہے۔ جدہ سے ذرا

آگے چل کر عالم اسلام کا مرکز مکہ ہے۔ رات ہوتے ہوتے ہم مدینہ کے سامنے سے گزریں گے۔ مکہ اور مدینہ بندرگاہیں نہیں ہیں بلکہ ساحل سے دور دو شہر ہیں۔ اس وقت ان شہروں کا خیال آتے ہی سوچ رہا ہوں کہ اگر ہماری اردو شاعری میں سے یہ دو شہر نکال دیے جائیں تو کیا باقی رہ جائے گا۔ غزلیہ شاعری؟ لیکن وہ بھی نامکمل۔ میری مراد اس وقت نعتیہ شاعری سے نہیں ہے بلکہ ساری اردو شاعری سے ہے۔ میر انیس کے مرثیوں کا پس منظر کربلا کا میدان سہی لیکن اصل انسپریشن کے مراکز تو یہی مکہ اور مدینہ ہیں نا؟ اردو کی سب سے بہترین نظم ہی کو لے لیجئے۔ خواہ وہ اسپین کی مسجد ہی سہی لیکن بات تو یہیں مکے اور مدینے سے چلتی ہے۔ میرا کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے علاوہ اردو شاعری کا اور کوئی رنگ ہی نہیں ہے۔ لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ اردو کی اعلیٰ شاعری کا بیشتر حصہ انہی شہروں کا اور اس تہذیب کا مرہونِ منت ہے۔ جس کے یہ دو شہر مرکز ہیں۔ نعتیہ شاعری یا سلام اور منقبت کی طرح کے اصناف سخن کو بھی آخر کیوں نظر انداز کیا جائے۔ ادب العالیہ کے نمونوں سے ان اصناف سخن کا دامن بھی مالا مال ہے۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ نعتیہ کلام میں تیسرے درجے کی شاعری کی مقدار پہلے درجہ کی شاعری سے کہیں زیادہ ہے۔ مسلمان اپنے ذوق عقیدت کی بنا پر نعت پر وجد کرتے ہیں اس لئے ابھی تک اعلیٰ نعتیہ کلام کا صحیح ادبی مقام متعین نہیں ہو سکا۔ نعتیہ کلام کے مجموعے جس قدر بھی شائع ہوئے ہیں۔ ان میں پہلے، دوسرے، تیسرے اور چوتھے درجہ کا ہر طرح کا کلام درج کر دیا گیا ہے اور پھر مرتبین کی یہ خواہش بھی ہوتی ہے کہ ہند و شعراء کا کلام بھی ان میں شامل ہو۔ خواہ اس کی کوئی ادبی قدر و قیمت ہو یا نہ ہو۔ یہ تمام باتیں مصلحت پر مبنی ہیں۔ ان کا نہ ادب سے تعلق ہے نہ روحانیت سے۔ اگر اردو اور فارسی کے نعتیہ کلام کے نادر نمونوں کو جمع کیا جائے تو ہمارا انداز نقد و نظر شاعری کے ایک بالکل ہی نئے باب سے آشنا ہو۔ مثلاً اقبال کا یہ قطعہ دیکھئے ؎

در آں صحرا کہ پیدا ساحلے نیست — دلیلِ راہ منزل جز دلے نیست
تو فرمودی رہِ بطحا گرفتیم — وگرنہ جز تو ما را منزلے نیست

یا گرامی مرحوم کی یہ رباعی دیکھئے۔ دنیا کے ادب میں اس کا جواب نہ ملے گا۔

کوثر چکد از لبم بہ ایں تشنہ لبی — خاور دمد از شبم بہ ایں تیرہ شبی
اے دوست ادب کہ در حریم دل ماست — شاہینۂ انبیاء رسول عربی

نظامی کا یہ شعر شاید آپ نے نہ سنا ہو۔

اے مدنی برقع و مکی نقاب — خیز کہ شد مشرق و مغرب خراب

مدت ہوئی جناب ممتاز حسن (احسن (چیئرمین پلاننگ کمیشن پاکستان) نے کسی ہندوستانی شاعر کا ایک نعتیہ شعر سنایا تھا۔ میں اس شعر پر مدتوں وجد کرتا رہا۔ دیکھئے گا ؎

دل از عشقِ محمدؐ ریش دارم — رقابت با خدائے خویش دارم

یہ تو خیر فارسی کی مثالیں ہیں۔ اردو میں حفیظ جالندھری کی نظم۔

یہ کس کے شوق میں پتھرا گئیں آنکھیں ستارو کی — زمیں کو تکتے تکتے آ گئیں آنکھیں ستاروں کی

اور پنڈت ہری چند اختر کا یہ شعر۔

کس نے ذروں کو اٹھایا اور صحرا کر دیا — کس نے نظروں کو ملایا اور دریا کر دیا

یا مولانا ظفر علیخاں کی نظم۔

وہ شمع اجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں — ایک روز چمکنے والی تھی کل دنیا کے درباروں میں

نعتیہ کلام کے ایسے نادر نمونے ہیں جنھیں اگر یکجا کیا جائے تو شاعری کا ایک شاہکار مرتب ہو سکتا ہے۔ مدت ہوئی میں نے حفیظ صاحب کی ایک اور نعت سنی تھی لیکن یہ مجھے کسی رسالے یا کتاب میں نظر نہیں آسکی۔ کہیں سے مل جائے تو میں اسے سنبھال کر اپنے پاس رکھ لوں۔ اس کے ابتدائی اشعار یہ ہیں۔ ؎

الصلوٰۃ والسلام اے رحمتہ اللعالمین — الصلوٰۃ والسلام اے صادق الوعد امیں
اے مدینے کے مہاجر سبز گنبد کے مکیں — عرش ہے تیرے قدم کے فیض سے یہ سرزمیں

غالباً پندرہ سولہ یا اس سے بھی زیادہ اشعار کی نظم ہے۔

اور پھر حضرۃ علی اور حضرت امام حسین کے بارے میں جوش صاحب کی نظمیں اور رباعیات دنیا کی کس زبان کی شاعری سے کم پایہ ہیں۔

جہاز نے (غالباً چٹانوں سے محفوظ رہنے کے لئے) سمندر کے عین وسط سے ہٹ کر مغربی ساحل کے قریب ہو کے چلنا شروع کر دیا ہے۔ اس وقت ساحل افریقہ کے پہاڑ پھر نظر آرہے ہیں۔ خورشید ان پہاڑوں کے پیچھے غروب ہو رہا ہے فضا میں رفتہ رفتہ ایک تاریکی پھیل رہی ہے۔ سمندر کی لہروں کا رنگ نیلگوں سے سیاہی مائل ہوتا جا رہا ہے۔ جہاز میں نئی زندگی کے آثار نظر آنے لگے ہیں۔ تھوڑی دیر میں ڈیک ویران اور شراب خانے اور ناچ گھر آباد ہو جائیں گے۔

آج دن بھر گرمی زیادہ رہی۔ دوپہر کے بعد جب سمندر پھر پرسکون ہو گیا اور ڈیک کی چھت کھول دی گئی تو ہوا میں برائے نام خنکی سی محسوس ہوئی لیکن یہ خنکی ہم ہندوستان والوں کے لئے تھی۔ اہل یورپ کے لئے گرمی اپنے جوبن پر رہی اس لئے نازنینانِ مغرب دن بھر غسل ہی کے لباس میں رہیں۔ تالابوں کے اندر بھی اور تالابوں کے باہر بھی۔ آج شام کو ایک کام سے میں جہاز کے دفتر میں گیا تو وہاں ایک فرانسیسی حسینہ برائے نام نیکر اور بلاؤز پہنے اپنے شوہر کے ہمراہ کھڑی تھی ہم مصر جانے والے چند مسافروں میں وہ حسینہ اور اس کا شوہر بھی شامل ہیں۔ مجھے دیکھ کر اس نے یہ اندازہ کیا کہ شاید میں بھی مصر ہی کی گرمی میں پلا ہوا کوئی حبشی ہوں ـــــ اور خدا میانوالی کے صحراؤں کو آباد رکھے وہاں کی گرمی افریقہ کی گرمی سے کم تھوڑا ہی ہوتی ہوگی۔ چنانچہ اس نے مجھ سے سوال کیا کہ کیا افریقہ کی گرمی میں ہم ایک دن رہ سکیں گے۔ میں نے جواب دیا کہ آپ کیا فرماتی ہیں۔ افریقہ آپ ہی کے تو دم قدم سے آباد ہے۔ یہ آپ ہی کے تو قدموں کی برکت ہے کہ افریقہ کی قسمت کا ستارہ آج انتہائی بلندیوں پر چمک رہا ہے۔ مشرقی افریقہ کے لوگ آج تک آپ کے گن گا رہے ہیں۔ آپ سے نہ جانے کیا غلطی ہوئی کہ الجزائر سے آپ اس قدر جلد جدا ہو گئے۔ ورنہ وہاں کے مسلمان تو تا قیامت آپ کے زیر سایہ زندگی بسر کرنے کے آرزومند تھے۔ اور وہ اس وقت بھی آپ کے جان و مال کو دعائیں دے رہے ہیں۔ آپ کو کبھی کبھی افریقہ کی سرزمین پر ضرور قدم رنجہ فرمانا چاہیئے۔ الجزائر نہ سہی مصر ہی سہی۔ وہ غالباً یہ طنز نہیں سمجھی یا شاید اس نے میری اس ساری ثنا خوانی کو درخور اعتنا نہیں جانا۔ کہنے لگی۔ سنا ہے مصر میں بہت گرمی پڑتی ہے۔ دن میں تو دھوپ بھی ہوتی ہے اور ہمیں اہرام مصر اور ابوالہول دیکھنے جانا ہے دھوپ میں نہ جانے کیسا لباس پہن کے جانا ہوگا۔ کپڑوں سے بے نیاز اس پری جمال کو لباس کے بارے میں اس قدر متفکر دیکھ کر میں نے کہا پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں آپ کوئی ہلکے باریک قسم کا لباس پہن لیجئے گا۔ بولی میں تو سمجھتی ہوں کہ جن

کپڑوں میں اس وقت ہوں یہی موزوں رہیں گے۔ اس کے شوہر نے بھی اپنی رفیقۂ حیات کی حامی بھری لیکن میں نے یہ مشورہ دیا کہ پرسوں رات ناچ کے وقت آپ نے جو لباس پہن رکھا تھا وہ میرے خیال میں زیادہ مناسب رہے گا ـــــ اور حقیقتاً وہ لباس ہی کیا تھا۔ میں تو مذکورہ رات کو جب کہ ناچ گھر میں یہ موم کی پتلی بدن کے خم و پیچ دکھا رہی تھی یہ بھی فیصلہ نہ کر سکا تھا کہ اس کے بدن پر لباس ستر کے لیے ہے کہ عریانی کے لیے۔ میں نے اپنی دانست میں بھرپور حملہ کیا تھا لیکن اس نے اسے مخلصانہ مشورہ سمجھا اور کہنے لگی میری تو اپنی رائے یہی ہے لیکن میرے شوہر کہتے ہیں کہ دن کے لئے وہ لباس موزوں نہیں لیکن میں وہ اپنے ساتھ رکھوں گی شام ہوتے ہی وہی پہن لوں گی۔

یا مظہر العجائب ـــــ یہ تو یورپ کی وہ جھلک ہے جو ابھی بحیرۂ قلزم میں محو سفر جہاز نیچونیا تک پہنچی ہے۔ جہاں یہ بجلی چمک رہی ہے وہاں کیا عالم ہوگا۔

اور میں حیران تھا کہ اگر یہ بنت مہر و ماہ ناچ کا لباس پہن کے ہماری ہم سفر رہی تو میں گویا مصر جا کر بھی مصر کو نہ دیکھ سکوں گا۔ یہ حسن عریاں ساتھ ہوگا تو میری نظریں عجائبات مصر کو دیکھیں گی یا اس عجوبۂ روزگار کو۔

باقیات غالب :- مرتبہ ڈاکٹر وجاہت سندیلوی۔ اسمیں غالب کا وہ تمام کلام موجود ہے جو متداول دیوان میں نہیں پایا جاتا قیمت دو روپیہ پچاس پیسے علاوہ محصول ڈاک

گلزار داغ :- حضرت داغ دہلوی کا پہلا دیوان جو عرصہ سے نایاب تھا۔ قیمت تین روپے پچاس پیسے علاوہ محصول ڈاک۔

آفتاب داغ :- حضرت داغ دہلوی کا دوسرا دیوان جو عرصہ سے نایاب تھا قیمت دو روپیہ علاوہ محصول ڈاک۔

بزم داغ :- حضرت داغ کی ڈائری مرتبہ احسن مارہروی و مولوی افتخار عالم قیمت تین روپیہ پچاس پیسے علاوہ محصول ڈاک۔

زبان داغ :- داغ دہلوی کے خطوط کا دلچسپ مجموعہ قیمت تین روپے پچاس پیسے

منیجر نگار۔ پاکستان کراچی نمبر ۳

ہندوستان کے خریدارانِ نگار

ازراہ کرم نوٹ کر لیں کہ اگست ۶۲ء کا نگار علیحدہ شائع نہیں ہوا تھا بلکہ ستمبر کی اشاعت میں شامل تھا۔

(منیجر)

فرمان فتحپوری

مومن کی حیات معاشقہ

مومن ۔ صاحب جی ۔ اور آزاد

کسی قدیم تذکرے یا کتاب میں اس کا ذکر ہو یا نہ ہو لیکن ایک مدت سے یہ روایت سینہ بہ سینہ محفوظ چلی آتی ہے کہ مومن خان مومن چونکہ محمد حسین آزاد کی ایک عزیزہ امت الفاطمہ صاحب جی سے عشق فرماتے تھے اس لئے آزاد نے آب حیات کے پہلے اڈیشن میں مومن جیسے نامور شاعر کو شامل کرنا پسند نہیں کیا۔ اگر یہ روایت صرف زبانی ہوتی تو خیر کوئی بات نہ تھی لیکن آج کل چونکہ ہر معاملے میں کرید و تلاش سے کام لیا جا رہا ہے اور مومن پر جو مقالات یا کتابیں لکھی جا رہی ہیں ان میں مومن اور صاحب جی کے معاشقے کا ذکر آزاد کے سلسلے میں اشارتاً اور صراحتاً کئے لگا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ مومن کے معاشقے کا تحقیقی جائزہ لے کر اس روایت کی صحت و عدم صحت کا سراغ لگایا جائے

یوں تو مومن ایک ایسے خاندان کے فرد تھے جس پر مذہب کا اثر غالب تھا اور جس میں بچپن ہی سے زہد و تقویٰ کا پابند بنانے پر زور دیا جاتا تھا۔ ان کے والد غلام نبی خاں حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی سے گہری ارادت رکھتے تھے۔ مومن جب پیدا ہوئے تو شاہ صاحب ہی نے ان کے کان میں آواز دی اور حبیب اللہ کے بجائے مومن نام تجویز کیا۔ ہوش سنبھالا تو شاہ عبدالقادر نے انہیں اپنے حلقۂ درس میں شامل کر لیا۔ چنانچہ مومن کی ابتدائی تعلیم و تربیت انہیں دونوں بزرگوں کے ہاتھوں ہوئی۔ ظاہر ہے ایسی فضا میں شاہد بازی کی دیوپہ گردی کا موقعہ کم رہا ہوگا۔ پھر بھی ہمیں اس نفسیاتی پہلو کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ بسا اوقات جنسی خواہش کو جس قدر اولاد کی کوشش کی جاتی ہے وہ اتنی ہی زیادہ قوت پکڑتی ہے۔ مومن کے ساتھ بھی یہی ہوا وہ جس ماحول کے تربیت یافتہ تھے اس میں دل و نظر دونوں پر سخت پابندی تھی۔ اس پابندی کا ردِ عمل بھی سخت ہوا اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مومن نے ایک سے نہیں بلکہ کئی پردہ نشینوں سے دل لگایا۔ ابتداً انہوں نے جنسی محبت کی آگ کو دبا رکھنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن بقول غالب:۔

کیا کس نے جگرداری کا دعویٰ — شکیبِ خاطرِ عاشق بھلا کیا

زیادہ دنوں تک ضبط کا یارانہ رہا۔ دل کے ساتھ ہوش و حواس اور صبر و استقلال سب ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے، جان کے عوض رگ و پے میں درد جاری و ساری ہوا۔ رازِ نہاں کا پاس باقی نہ رہا۔ جیسا کہ خود مومن نے ایک مثنوی میں بیان کیا ہے:

رحم کی اس سے آس کہاں تک — رازِ نہاں کا پاس کہاں تک
ضبط کہاں تک جی پہ بنی ہے — صبر کہاں تک اپنے بھی جو ہے
جان کو کب تک کوئی کھووے — اب تو کہیں گے ہووے سو ہووے
رخصت نام و ننگ ہے اب تو — قافیہ اپنا تنگ ہے اب تو

اب تو کدورت دل کی نکالیں — خاک کہاں ہر بات پہ ڈالیں
کھوتے ہیں اب راز نہانی — شوخ بھی دیکھے شوخ بیانی

مومن نے اپنے راز نہاں کو کس طرح کھولا ہے اور کس شوخی سے بیان کیا ہے۔ اس کا اندازہ کرنے کے لئے ان کی مثنویوں کا مطالعہ ضروری ہے مومن نے اپنی مثنویوں میں اپنے معاشقوں کا تذکرہ محض سرسری نہیں کیا۔ بلکہ عشق و عاشقی کے پس منظر، آغاز و انجام۔ نوعیت و کیفیت اور تلخی و شیرینی ہر پہلو پر تفصیل و بے باکی سے روشنی ڈالی ہے۔ لوگ عام طور پر اپنے معاشقوں اور منہبی علائق و شخصیت کا تاریک پہلو خیال کر کے ڈھکائے چھپائے رکھتے ہیں اور دبی زبان سے بھی کبھی ان کا ذکر کرنے کی ہمت نہیں کرتے لیکن مومن کی اخلاقی جرأت کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنے ماحول و خاندان اور نام و ناموس کا لحاظ کئے بغیر جگہ جگہ اپنی عشق بازیوں کی تشہیر اس طرح کرتے ہیں:۔

اس شہر میں ایک نوجواں تھا — عشاق میں شہرۂ جہاں تھا
تھا نام تو مومن اور دین کفر — جاں محو بتاں و دل نشیں کفر
رسوائے زمانہ تیرہ ایام — آوارہ و ہرزہ گو و بدنام
ربط اس کو بتانِ نازنیں سے — دنیا سے نہ کام کچھ نہ دیں سے
آشفتۂ کاکلِ پریشاں! — انداز پرست کفر کیشاں!
مدہوش شراب نوجوانی — سرشار نشاط کامرانی
آرام و طرب میں صرف اوقات — مشغول سرور و عیش دن رات
ہر لحظہ سیاہ مست کافر — تھا: یک ہی بت پرست کافر
ناگاہ کسی سے دل لگایا — اک رشک پری سے دل لگایا
اک بت کا ہوا وہ آستاں بوس — مومن سے بنا برہمن افسوس

(مثنوی قصۂ غم مرقومہ ۱۲۳۵ھ بعمر بیس سال)

نہیں اشعار یہ ہیں نالے کئی — سوزش دل کے ہیں بتخالے کئی
یعنی اک شوخ پہ ہم مرتے تھے — صدقے دل جان نذر کرتے تھے
دیکھی کیا کیا نہ تباہی میں نے — مدتوں پھر بھی تباہی میں نے
ناگہاں تھی وہ کہیں کوٹھے پر — مرے آنے کی نہ تھی اس کو خبر
بے خبر سامنے آئی اک بار — بیدھڑک ہو گئی مجھ سے دوچار
دیکھتے ہی مجھے غش آنے لگا — ہوش بھی صبر نمط جانے لگا

(مثنوی قول غمیں مرقومہ ۱۲۳۶ھ بعمر ۲۱ سال)

بسکہ طبیعت مشغلہ جو تھی — اپنی سدا سے چاہ کی خو تھی
اہل جفا میں دھوم تھی اپنی — جور کشی معلوم تھی اپنی

شوق نہاں مشہور ہمارا — دیکھ جہاں مذکور ہمارا
مہر وشوں سے لاگ ہی دل کو — گرم رکھے اب آگ ہی دل کو
ایک نہ اک سے کام ہی ہوے — نام سدا بدنام ہی ہوے

(مثنوی تف آتشیں مرقومہ ۱۲۴۱ھ بہ عمر ۲۵ سال)

ہو چکی ہے کیسی رسوائی مری — شہرہ ہے ہنگامہ آرائی مری
وحشیانِ عشق کا سرخیل ہوں — خانہ بربادی میں اشک سیل ہوں
جا بجا قصہ مرا مشہور ہے — اہل وجد و حال تک مذکور ہے

(حسین معصوم مرقومہ بہ عمر ۲۸ سال)

جب ہم مومن کے زہد و تقدس آمیز ماحول اور ان کے مذہبی عقاید و رجحانات پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کے یہ اعلانات ہمیں بڑے حیرت انگیز معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ خود ان کے بیانات اور ان کی زندگی سے ظاہر ہے مومن بہ یک وقت رند شاہد باز بھی تھے اور دیندار بھی۔ انہیں تصوف سے شغف نہ تھا۔ اس لئے دوسرے شعرا کی طرح انہوں نے مجازی عشق کو حقیقت کا زینہ تو نہیں بنایا لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ ان کا ایک قدم بت خانے میں تھا تو دوسرا مسجد میں۔ اپنے خاندانی ماحول اور ابتدائی تعلیم و تربیت کے زیر اثر وہ مذہب کے سختی سے پابند تھے دوسری طرف شاہدان مجازی کے ساتھ کھل کھیلنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ ایک طرف وہ پردہ نشیں زہرہ جمالوں پر جان چھڑکتے تھے تو دوسری طرف سید احمد شہید بریلوی کے ساتھ جہاد میں شریک ہو کر جام شہادت نوش فرمانے کا شوق بھی دل میں رکھتے تھے۔ یہ بات اس لئے کہی جا رہی ہے کہ مومن کی عشق بازی اور سید احمد شہید کی تحریک جہاد اور مومن کا ان سے بیعت ہونے کا زمانہ ایک ہی ہے۔ مومن کی ساری عشقیہ مثنویاں جو ان کے معاشقوں کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں خود مومن کی دی ہوئی تاریخوں کے مطابق ۱۲۳۱ھ اور ۱۲۴۶ھ کے درمیانی عرصے میں لکھی گئی ہیں۔ یہی وقت سید احمد شہید کی تحریک کے عروج کا ہے۔ اس لئے کہ سید احمد شہید نے ۱۲۳۶ھ میں سکھوں کے خلاف جہاد کی تحریک پیش کی۔ حج سے واپسی پر ۱۲۴۱ھ میں جہاد کے لئے روانہ ہوئے اور پانچ سال برسر پیکار رہ کر ۱۲۴۶ھ میں شہید ہوئے۔ اسی دوران میں مومن خاں سید احمد شہید سے بیعت ہوئے۔ اور لشکر اسلام کا دل بڑھانے کے لئے ایک مثنوی بہ عنوان جہاد لکھی۔ اس میں اپنے شوق شہادت کا اظہار اس طور کیا ہے:۔

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب — یہ افضل سے افضل عبادت نصیب
الٰہی اگرچہ ہوں میں تیرہ کار — پہ تیرے کرم کا ہوں امیدوار
تو اپنی عنایت سے توثیق دے — عروج شہید اور صدیق دے
کرم کر نکال اب یہاں سے مجھے — ملا دے امام زمن سے مجھے
یہ دعوت ہو مقبول درگاہ میں — مری جاں فدا ہو اس راہ میں

ایک طرف یہ مذہبی جوش و خروش دوسری طرف ہوسناکی و عیش کوشی کی وہ ہنگامہ خیزیاں جن کا ذکر انہوں نے اپنی مثنویوں میں کیا ہے اب نہ انہیں کافر کہتے بنتی ہے نہ مومن۔ جس زمانے میں اپنے پیر و مرشد سید احمد شہید کے لشکریوں میں شامل ہو کر عاقبت سنوارنے کی فکر

ہو رہی ہے۔ عین اسی زمانے میں "تا بربہ عیش کوش کہ دنیا دوبارہ نیست" کے مصداق پردہ نشینانِ خوش جمال کی صحبتوں میں ذوق گناہ کی داد طلب کی جارہی ہے۔ بظاہر ان دو متضاد مشغلوں کا اجتماع عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ان کی واقعیت میں شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ یوں بھی مومن نے اپنی سیرت کے جن متضاد و متخالف پہلوؤں کا ذکر کیا ہے وہ بذات خود اتنے حیرت انگیز نہیں ہیں۔ کوئی ان کا اظہار کرے یا نہ کرے۔ لیکن جن واقعات کے اظہار میں جس بے باکی اور اخلاقی جرات سے کام لیا ہے وہ البتہ حیرت انگیز ہے۔ اس لئے کہ مومن نے اپنی سیرت کے رسوا کن پہلوؤں کو جس طرح کھول کر ہمارے سامنے رکھدیا ہے عام انسانوں میں اس کی ہمت بہت کم ہوتی ہے۔ خود میر کو اپنی روداد محبت بالاعلان سنانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ انہوں نے ذکر میر میں سراج الدین علی خاں آرزو کو برا بھلا تو کہا ہے لیکن اپنی کمزوریوں کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنی آپ بیتیوں میں اپنے اوصاف و کمالات کا اظہار تو کر جاتا ہے لیکن اپنے عیوب کو اس طرح چھپا جاتا ہے۔ گویا وہ انسان نہیں فرشتہ تھا۔ مومن نے یہ نہیں کیا۔ بلکہ اپنی شخصیت کے دونوں رخ سامنے رکھدیئے۔ ورنہ اُن کا گناہ اس دنیا میں نیا نہیں ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ دوسرے اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں اور مومن نے سعدی کے لفظوں میں اسے آسمان پر اچھال دیا ہے۔

ہیچ کس بے دامنِ تر نیست الا ریگراں بازمی پوشند ما در آفتاب افگندہ ایم (سعدی)

اخلاقی نقطۂ نظر سے ممکن ہے کہ مومن کی بے باکی اور اخلاقی جرأت کو عیب قرار دیا جائے لیکن ادبی نقطۂ نظر سے یہ باتیں بہت اہم ہیں۔ مومن کے بعض ایسے پہلوؤں کو بے نقاب کرتی ہیں جن کو ذہن نشین کئے بغیر مومن کے مزاج و کلام کو سمجھنا اور ان کے عشقیہ جذبات سے لطف اندوز ہونا مشکل ہے۔ اسی لئے ان کی مثنویوں یا منظوم معاشقوں کا تفصیلی جائزہ لینا ضروری ہے۔

مومن نے اپنی عشق بازی کے جو افسانے مثنویوں میں بیان کئے ہیں ان کا آغاز کب اور کس طرح ہوا۔ اس سلسلے میں ہمیں مومن کی پہلی عشقیہ مثنوی شکایت ستم سنہ ۱۲۳۱ھ کی طرف رجوع کرنا چاہیئے اس مثنوی میں مومن خاں نے خود اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ انہیں عشق کا چرکا بچپن ہی سے لگ چکا تھا۔ اور اس کے نتائج و اثرات سے بے خبر رہ کر نو سال کی عمر ہی میں انہوں نے حفظِ نفس کا سامان مہیا کرنا شروع کر دیا تھا۔ چند شعر دیکھئے

یعنی بچپن سے ہوں میں پیر مغاں بلکہ گمراہان راہ جہاں
تھے برس ہم شمارۂ افلاک کہ ہوا پائمال صورت خاک
کھو دیا چین ایک مہر دنے شب سیہ کی ہلالی ابرو نے
ہائے بچپن کا دل کا آجانا کچھ سمجھتے نہ تھے پہ کیا جانا
شغل طفلانہ دل کے پاس گئے ہوش کے آتے ہی حواس گئے
شوق آیا تو دل نوازی کا کھیل کھیلے تو عشق بازی کا (شکایت ستم)

جس مثنوی کے یہ اشعار ہیں وہ ۱۲۳۱ھ میں لکھی گئی ہے۔ اس وقت مومن کی عمر سترہ کے لگ بھگ تھی جیسا کہ ان کے اس شعر سے ظاہر ہے۔

دیکھیں آگے دکھائے کیا کیا دن ہے ابھی سترہ برس کا سن

اس سے یہ بات طے پا جاتی ہے کہ مومن نے ۱۲۳۱ھ میں بہ عمر سترہ سال کوچہ عشق و ہوس میں پہلی بار قدم رکھا اور اس راہ میں جو واقعات پیش آئے انہیں اسی سال شکایت ستم کے نام سے نظم کر دیا۔ شکایت ستم میں ان کے دو معاشقوں کا سراغ ملتا ہے۔ پہلا معاشقہ صرف دو سال تک قائم رہا۔

آفت جان و دل فراق و وصال الغرض یوں ہی کٹ گئے دو سال

اس کے بعد محفلِ طرب اٹھ گئی۔ محبوبہ پر سخت پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ اور چند دنوں میں وہ مجبور و مہجور اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔

تنگیِ دہر وحشت افزا تھی — پیشِ دل قیامت آرا تھی
بہرِ تسکین شدتِ خفقاں — ٹھہری گلگشتِ روضۂ رضواں
گئی جنت میں بس کہ ایسی حور — ہوئی بیتاب کیسی کیسی حور

اسی مثنوی میں ایک دوسرے معاشقے کی داستان شروع ہو گئی ہے۔ اس میں محبوبہ سے روابط کی کیا نوعیت تھی۔ اس کا اندازہ ان اشعار سے کیجئے۔

ربط جذبِ دل واثر کیا کیا — دونوں مشتاق یکدگر کیا کیا
کوئی آیا تو ہٹ گئے ناچار — ورنہ ہر لمحہ شغلِ بوس و کنار
اک برس تک رہا یہی عالم — زندگی کے مزے اٹھائے ہم

ایک سال بعد ایک حیّالہ کے بہکانے سے آپس میں کچھ اَن بَن ہو گئی۔ دونوں کو رسوا و بدنام ہونا پڑا۔ لیکن کچھ دنوں بعد باہم ملاقات کی صورتیں پھر پیدا ہو گئیں۔ اور عیش رفتہ واپس آ گیا جیسا کہ ان اشعار سے ظاہر ہے۔

ہو گئے دل سے دور کیں و عناد — مل گئی بارے جو تھی اپنی مراد
پھر مئے وصل سے ہوئے بے ہوش — بن گیا گھر دکانِ بادہ فروش
اس کی دلبستگی کے ہائے مزے — خوب دل کھول کر اٹھائے مزے
یوں ہی اک چند ارتباط رہا — دورۂ عشرت و نشاط رہا

بعد ازاں ایک پیرزال نے عاشق و محبوبہ میں ایسا افتراق ڈالا کہ پھر دوبارہ ملنے کی نوبت نہ آئی۔

مومن کی دوسری مثنوی ۱۲۳۵ھ میں "قصہ غم" کے نام سے وجود میں آئی ہے۔ اس میں مومن کے کسی نئے معاشقے کا سراغ نہیں ملتا بلکہ جن معاشقوں کا ذکر پہلی مثنوی شکایت ستم میں آیا ہے۔ انہیں کی یاد تازہ کی گئی ہے۔

مومن کی تیسری مثنوی قول غمیں مرقومہ ۱۲۳۶ھ میں البتہ ان کے ایک نئے معاشقے کا ذکر ملتا ہے۔ اس میں ایک ایسی محبوبہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ جو علاج کی غرض سے پڑوس میں آئی ہوئی تھیں۔ اور جن کے معالجے کے لئے حکیم مومن خاں مومن کو بلایا گیا تھا۔ محبوبہ چونکہ علاج کی غرض سے بطور مہمان مقیم تھیں۔ اس لئے مومن سے لگاؤ کے باوجود چار و ناچار اپنے وطن پورب کو واپس جانا پڑا۔ اس طرح یہ تیسرا معاشقہ بھی ختم ہو گیا۔

چوتھی مثنوی لف آتشیں مرقومہ ۱۲۴۱ھ میں مومن ایک نئی داستان محبت کا ذکر کیا ہے۔ اس میں جس محبوبہ کا ذکر ہے وہ پڑوس میں شادی کی ایک تقریب میں شرکت کرنے آئی تھیں۔ مومن سے آنکھ لڑی اور دونوں ایک دوسرے پر عاشق ہو گئے۔ کچھ دنوں رنگ رلیاں مناتے رہے۔ لیکن ایک کٹنی نے محبوبہ کے کچھ ایسا بھرا کہ وہ مومن سے ہمیشہ کے لئے بدظن ہو گئی۔ اور پھر کبھی ملاقات نہ ہوئی۔

پانچویں مثنوی حسین مغموم مرقومہ ۱۲۴۴ھ میں اولاً گزشتہ معاشقے کی محبوبہ کی بے وفائی کا تذکرہ ہے۔ بعد ازاں ایک نئی محبوبہ کے عشق کا قصہ سنایا گیا ہے جس سے مومن کی ملاقات اتفاقاً حسینوں کے ایک جھرمٹ میں ہو گئی تھی۔ محبوبہ نے پہلے تو تغافل سے کام لیا۔ لیکن رفتہ رفتہ عشق نے اس پر بھی اثر کیا۔ اور پیام و پیام کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ وصال کی شادمانیاں بھی میسر آئیں۔ لیکن جس کریہ المنظر عورت نے پچھلی محبوبہ کو چھڑایا تھا۔ اس نے اس معاشقہ میں بھی رخنہ ڈالا۔ اور

محبوبہ مومن سے ہمیشہ کے لئے بدگمان ہو گئی۔

چھٹی مثنوی ۱۲۴۶ھ میں "آہ و زاری" کے نام سے کہی گئی ہے۔ اس میں کسی نئی واردات کا ذکر نہیں ہے۔ بلکہ پچھلی محبوبہ سے اپنی خستہ حالی کا واسطہ دیکر رحم و کرم کی درخواست کی گئی ہے۔ محبوبہ چونکہ مذہباً شیعہ ہے اور شاید عقیدے کا اختلاف یک جان دو قالب ہونے میں حارج تھا۔ اس لئے اس کو ہم مذہب بنانے اور اس کی تبدیلی عقائد کی دعا مانگی گئی ہے۔

یہ چھ مثنویاں جس میں مومن نے اپنے معاشقوں کا مفصل ذکر کیا ہے اور جو ۱۲۳۱ھ اور ۱۲۴۶ھ کے درمیان لکھی گئی ہیں صاف پتہ دیتی ہیں کہ مومن کے معاشقوں کا سلسلہ پندرہ سولہ سال تک برابر قائم رہتا ہے۔ اس سارے زمانے میں مومن فی الواقع کتنی بار دام عشق میں گرفتار ہوئے اور ان کے کیا نتائج ہوئے اس کے متعلق وثوق سے کچھ کہنا آسان نہیں ہے۔ اس لئے کہ مومن نے خود جگہ جگہ اور بار بار دل لگانے کا دعویٰ کیا ہے۔

ایک نہ اک سے کام ہی ہوئے — نام سدا بدنام ہی رہوئے (تف آتشیں)

آشناؤں میں سدا گھر میں کہاں — گہ وہاں، گاہ وہاں، گاہ وہاں (قول غمیں)

مومن کے معاشقوں کا جو تاریخی خاکہ مثنویوں کی مدد سے اوپر دیا گیا ہے۔ اس سے اُن کے معاشقوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ پانچ تک پہنچتی ہے۔ پہلے دو کا ذکر "شکوت ستم" مرقومہ ۱۲۳۱ھ میں، تیسرے کا ذکر "قول غمیں" میں، چوتھے کا ذکر "تف آتشیں" میں اور پانچویں کا ذکر "حنین مغموم" میں کیا گیا ہے۔ حنین مغموم کے شروع میں آخر بخش نامی کے معاشقے کی مزید تفصیل ہے لیکن بعد میں مومن نے جو داستان سنائی ہے۔ اس کے متعلق بھی میرا خیال ہے کہ وہ نئی داستان محبت نہیں ہے بلکہ اس میں کوئی نئی بات یعنی صاحب جی کا داستان سے تو از سر نو دہرایا گیا ہے۔ مثنوی کے یہ اشعار خاص طور پر اس خیال کو تقویت پہنچاتے ہیں

وقت رخصت مضطرب — دیکھ کر حسرت زدہ رونے لگی

چلتے چلتے کہدیا جلد آ... — کچھ بہانا ہو نہ ہو ہو جائیو

مضطرب رکھنے لگی آوارگی — صاحبی اور اس قدر بے چارگی

اب اگر اسے درست خیال کیا جائے تو مومن کے معاشقوں کی تعداد صرف چار رہ جاتی ہیں۔ لیکن بعض حضرات نے مومن کی مثنوی میں آٹھ معاشقوں کی نشان دہی کی ہے۔ اس سلسلے میں ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

شکایت ستم ۱۲۳۱ھ ان کی پہلی مثنوی ہے جس میں انہوں نے اپنے پہلے عشق کی تفصیل پیش کی ہے۔ خوب خوب ملاقاتیں رہیں بالآخر وہ مرگئی۔ ایک ہمسائی نے دل بہلایا۔ ابھی وہ اس سے لطف لے ہی رہے تھے کہ ایک اور محبت کا آغاز ہوا۔ لیکن اس میں انہیں کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کے بعد ایک اور سلسلہ شروع ہوا۔ لیکن اس میں بھی وہ ناکام ہوئے۔ اس کا بیان ان کی دوسری مثنوی قصۂ غم میں موجود ہے۔ جب یہ قصہ ختم ہوا تو ان کا وہ عشق شروع ہوا جس کی داستان انہوں نے قول غمیں میں لکھی ہے۔ یہی صاحب جی کا عشق تھا۔ بالآخر صاحب جی کو پورب بھیج دیا گیا۔ چنانچہ ایک شادی کے موقعہ پر انہوں نے کسی کو دیکھ لیا اور اس کو دل دے بیٹھے۔ لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ اور وہ اس کے فراق میں بیمار رہنے لگے۔ اس کے بعد ایک محبوبہ سے انہوں نے اور دل لگایا۔ لیکن وہ بال میں نہ پھنسی اور اس طرح یہ قصہ بھی ختم ہو گیا۔ آہ و زاری مظلوم ان کی آخری مثنوی ہے۔ اس میں ایک محبوبہ کا ذکر ہے جس نے ان کی طرف توجہ نہیں کی۔ غرض مومن نے کئی عشق کئے ہیں۔" [1]

اس اقتباس سے مومن کے معاشقوں کی تعداد کم از کم آٹھ متعین ہوتی ہے۔ لیکن یہ خیال درست نہیں معلوم ہوتا۔ مومن کی مثنویوں میں ان کے معاشقوں کی تعداد چار یا پانچ سے زیادہ نہیں ہے۔

---

[1] مومن اور مطالعہ مومن ص ۱۲۳

اب رہا یہ سوال کہ ان معاشقوں کے پردے میں کون کون تھا، اور ان کے تعلقات کی نوعیت و حقیقت کیا تھی۔ اس کی تفصیل مومن نے نہیں بتائی۔ پھر بھی مثنوی کے بعض قرائن و اشارے دو ایک پردہ نشینوں کا سراغ لگانا مشکل نہیں۔ اتنی بات تو واضح ہے کہ انہوں نے ہمیشہ جنس لطیف سے دل لگایا ہے۔ انہوں نے اپنی محبوبوں کے شمائل و خصائل کا ذکر جس طور پر کیا ہے۔ ان سے یہ بات بھی وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ انہوں نے طوائفوں یا شاہدان بازاری سے سلسلۂ عشق قائم نہیں کیا بلکہ سدا اپنے ہم مرتبہ خاندان کی پردہ نشیں خواتین کے دلدادہ رہے ہیں۔ مثلاً شکایت ستم کے پہلے معاشقے کے یہ اشعار۔

ہوئی شادی ہمارے یاں اکبار — آئی مہماں وہ دولت بیدار
شرکت محفل سراپا زیب — اس کے آنے کی ہو گئی تقریب
ایک خالی مکان میں آکر — مل گئی چپکے چپکے ڈھب پاکر

صاف پتہ دیتے ہیں کہ محبوبہ کوئی غیر نہ تھی بلکہ اس کا تعلق یقیناً کسی ایسے گھرانے سے تھا جو مومن سے رشتۂ قرابت رکھتا تھا یا پھر ان سے گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ اس کے بغیر شادی کی تقریب میں محبوبہ کا آنا۔ اور چپکے چپکے ڈھب پاکر خالی مکان میں محبوب سے ملنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ یہ لڑکی دوسرے عزیز و اقارب کے ساتھ تقریب میں شرکت کے لئے آئی تھی۔ دو دن رہی واپس چلی گئی۔

آگیا وہ ہی دن میں شور نشور — منتشر ہو گئی وہ بزم سرور

اس کے بعد کچھ ایسے حالات رونما ہوئے کہ دوبارہ ملنے کا موقع ہاتھ نہ آیا۔

وہ ملاقات آخری ہے ہے — کیسی دلداریاں مری ہے ہے

طالب و مطلوب دونوں کا عنفوان شباب تھا۔ نئی نئی چوٹیں تھیں۔ پہلی پہلی محبت تھی۔ جدائی کیا ہوئی قیامت گذر گئی۔ محبوبہ عورت ذات زیادہ دنوں ضبط کا یارا نہ لا سکی۔ اور غم فراق میں جان سے گذر گئی۔ مومن کے لئے زندگی کا یہ پہلا حادثہ تھا سخت صبر آزما ثابت ہوا۔ چنانچہ اس مثنوی میں مومن نے یہ زاری اور آہ و بکا کا ایک طویل سلسلہ چھیڑا ہے اس محبوبہ کا کیا نام تھا اس کے متعلق بھی تحقیق سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ لیکن اس مثنوی کے بعض اشعار سے ایسا گمان ہوتا ہے کہ اس کا نام "حور" یا "حور طلعت" رہا ہوگا مثلاً

گئی جنت میں بس کہ ایسی حور — ہوئی بیتاب کیسی کیسی حور

یہاں "حور" کا اشارہ اسم علم پر بھی صاف دلالت کرتا ہے۔ کلیات مومن میں ترجیع بند کی صورت میں جو مرثیہ ملتا ہے۔ اس کا عنوان مرثیۂ حور طلعت ہے۔ "شمیم" بھی اس خیال کو قدرے تقویت پہنچاتا ہے۔ مومن نے اپنی مثنویوں میں جن محبوباؤں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں صرف پہلی مثنوی کی محبوبہ ایسی تھی جو مومن سے شدید محبت کرتی تھی۔ اور جس نے مومن کے فراق میں جان دیدی تھی۔ مومن کی یہ اولین محبت تھی۔ محبوبہ کی اس وفاداری اور جاں سپاری کا ضرور ان پر گہرا اثر ہوا ہوگا اور ممکن ہے یہ مرثیہ انہوں نے اسی کے غم میں لکھا ہو۔ کسی اور مثنوی سے ان کی کسی محبوبہ کے انتقال کا سراغ نہیں ملتا۔ اس لئے اس مرثیے کو کسی اور سے منسوب کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا ہے۔ صاحب جی کا مرثیہ بھی نہیں کہہ سکتے۔ اس لئے کہ مومن کے فراق میں صاحب جی کا جان دینا کہیں سے ثابت نہیں ہوتا۔ معلوم نہیں ڈاکٹر عبادت بریلوی نے قول غیس "کے کن اشعار سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ "صاحب جی نے خودکشی کی" تھی۔ مثنوی میں کہیں اس قسم کا اشارہ نہیں ہے۔ صاحب جی کے پورب چلے جانے پر مثنوی ختم ہو جاتی ہے۔ آخر میں صاحب جی کی محبت پر اعتماد کر کے تاثیر عشق کی ایک مثال ضرور دی گئی ہے۔ لیکن وہ صرف اس تیکین کے لئے ہے کہ صاحب جی اور مومن کبھی نہ کبھی دوبارہ ضرور ملیں گے۔ ان کی محبت ایک نہ ایک دن رنگ لائے گی۔ اور ان کا فراق وصال میں بدل جائے گا۔ اس سے یہ نتیجہ کسی طرح مرتب نہیں ہوتا کہ صاحب جی نے خودکشی کر لی تھی۔ اس لئے میں مومن کے مذکورہ مرثیہ کو ان کی پہلی محبوبہ کا مرثیہ خیال کرتا ہوں اور اسی سے

گمان ہوتا ہے کہ شاید اس کا نام "حور طلعت" رہا ہو۔

شکایت ستم کے دوسرے معاشقے میں ایک ایسی محبوبہ کا ذکر آیا ہے جو بیک ان کے سر بالیں آموجود ہوتی ہے۔

دیکھتا کیا ہوں ایک زہرہ جبیں — جلوہ افروز ہے سر بالیں

اس زہرہ جبیں کی عمر اس وقت غالباً بارہ سال تھی۔

سال عمر اب تھے ہم شمارِ برج — کہ ہوا اختر بلا کا عروج

مومن اس دوازدہ سالہ حسینہ پہ عاشق ہو جاتے ہیں۔ اور پورے ایک سال تک ہم آغوشی کا لطف اٹھاتے ہیں۔

برس تک رہا یہی عالم — زندگی کے مزے اٹھائے بہم
بعد یک سال قصہ دیرینہ — چرخ بیداد گر زمیں کینہ
آگیا اپنی کج خرامی پر — عشق ہوا داغ گونہ کامی پر

لیکن مومن نے اس محبوبہ کے حسب نسب کا بھی کوئی پتہ نہیں دیا۔ مثنوی کے اشعار سے یہ ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ یہ زہرہ جبیں مومن کے قریبی رشتہ داروں میں تھی اور اسی رشتے کی قربت نے انہیں اس سے ملنے کے بے تکلف مواقع بہم پہنچائے تھے۔ اس شعر سے۔

کئی دن بعد ایک شب تنہا — اتفاقاً ملی وہ مہ سیما

البتہ یہ خیال ہوتا ہے کہ اس معاشقے کی محبوبہ کا نام "سیما" تھا ہر چند کہ "مہ جبیں" اور "زہرہ جبیں" کی ترکیب طرح "مہ سیما" کی ترکیب بھی تمام توصیفی مرکب کی حیثیت سے استعمال ہوتی ہے۔ پھر بھی دوسری مثنویوں کے بعض اشعار سے اس خیال کو قوت پہنچتی ہے کہ ان کی ایک محبوبہ کا نام سیما ضرور تھا چھٹی مثنوی "آہ و زاری مظلوم" میں جس محبوبہ کی خصوصیات و صفات بیان کی گئی ہیں۔ اور جس میں گزشتہ معاشقے کے تاثرات پیش کئے گئے ہیں۔ اگر ان کا تعلق فی الواقع "شکایت ستم" کے دوسرے معاشقے سے ہے تو پھر یقیناً اس محبوبہ کا نام "سیما" تھا۔ جیسا کہ ان اشعار سے مترشح ہوتا ہے۔

کہاں اے بدر سیمادہ ترحم — کہ ہوں میں رازدار صرد انجم
نہیں کیوں گرمی صحبت کا ایما — کہ میں پروانہ ہوں تم شمع سیما

مثنوی حنین مغموم میں بھی محبوبہ سے دوبارہ ملنے اور عیش رفتہ کو واپس لانے کی آرزو اس طور پر کی گئی ہے۔

پھر فروغ ماہِ سیما دیکھ لوں — چشم حیراں کا تماشہ دیکھ لوں

ان اشعار میں خاص طور پر دوسرے شعر میں "سیما" کا لفظ صاف اسم علم پر دلالت کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مومن نے اس پر ذو معنویت کا پردہ ڈالنے یا صنعت ایہام سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہو۔

مومن کے تیسرے معاشقے کی تفصیل "قول غمیں" میں دی گئی ہے۔ اس میں محبوبہ کے سب و نسب یا نام کے متعلق مومن نے کوئی وضاحت نہیں کی لیکن مومن نے آغاز عشق کے بیان میں کچھ ایسی وضاحتیں کر دی ہیں کہ اس مثنوی کے محبوبہ کا سراغ لگانا مشکل نہیں رہ جاتا۔ مومن ایک طبیب کی حیثیت سے ایک محترمہ کے معالجے کے لئے بلائے جاتے ہیں۔ اور نبض پر ہاتھ رکھتے ہی ہاتھ سے دل نکل جاتا ہے۔ ؎

میں نے اس نبض پر جو ہاتھ رکھا — ہاتھ سے میرے مرا دل بھی چلا
اس کو جوں ہاتھ لگایا میں نے — دل سے بس ہاتھ اٹھایا میں نے

بلا کسی خارجی شہادت کے اس مریضہ کا نام لینا مشکل تھا۔ لیکن نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے بے تامل واضح کر دیا ہے کہ ان کا نام امت الفاطمہ تھا۔ شیفتہ کا بیان ہے کہ

"ان کا نام امت الفاطمہ بیگم تھا۔ صاحب جی کے نام سے مشہور تھیں۔ حسن و صفات میں مثل آفتاب تھیں۔ اپنے معالجے کے سلسلے میں مومن خاں سے سابقہ پڑا۔ کچھ مہینے زیر علاج رہیں۔ مدت ہوئی کہ لکھنؤ چلی گئیں۔ خان موصوف کی مثنوی قول غمیق انہیں کے حسن و جمال کی شرح ہے۔ المختصر ان کے فیضان صحبت سے ان کی طبیعت شعر و شاعری کی طرف مائل ہوئی۔ اور موزونی قدموزونی طبع کی طرف راغب ہوئی۔ اور ان زلف پریشاں کی زینت اشعار گوئی میں مبتذل ہوئی"[1]

اس بیان کے بعد شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اور قول مخمین کے معاشقے کی محبوبہ صاحب جی ہی قرار پاتی ہیں۔ مومن کے یہاں متعدد اشعار ایک غزل میں صاحب جی کی ردیف میں موجود ہے۔ اور اس بات کا یقین دلاتی ہے کہ مومن اور امت الفاطمہ کے عشق کا واقعہ یکسر سچا ہے۔

یہی امت الفاطمہ صاحب جی ہیں جن کے متعلق یہ روایت سینہ بہ سینہ چلی آتی ہے کہ وہ آزاد کی کوئی عزیزہ تھیں۔ اور آزاد نے اسی واقعہ کی بنا پر مومن کا ذکر آب حیات کے پہلے اڈیشن میں نہیں کیا۔ ڈاکٹر عبادت صاحب لکھتے ہیں کہ

"بعض لوگوں کا یہ خیال ہے لیکن انہوں نے اس کو لکھا نہیں اور وہ اس کو لکھ بھی نہیں سکتے تھے کہ امت الفاطمہ بیگم صاحب کا تعلق دلی کے ایک مشہور خاندان سے تھا۔ اس خاندان میں بہت سے ادیب و انشا پرداز پیدا ہوئے ہیں۔ صاحب جی ان کی قریبی عزیزہ تھیں"[2]

عبادت صاحب نے ان لوگوں کا نام نہیں لیا جو اس قسم کا اظہار خیال کرتے ہیں۔ نام بھی کس کس کا لیتے۔ اس لئے کہ سبھی لوگ یہی گمان کرتے ہیں انہوں نے اس سلسلے میں آزاد کا نام لینے سے بھی گریز کیا ہے۔ پھر بھی یہ کہ امت الفاطمہ کو دلی کے اچھے ادیب اور انشا پرداز کی عزیزہ تھیں، واضح کر دیتا ہے کہ ان کا اشارہ آزاد کے سوا کسی اور طرف نہیں ہے"۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بیاض سالک اور برکت خیرآبادی کی مثنوی میں اس معاشقے کی تفصیل موجود ہے۔ مولانا ابوالخیر مودودی کے خط کا ایک اقتباس دیکھئے۔

"بیاض سالک تو ناقابل یافت ہے۔ برکت خیرآبادی کی مثنوی ممکن ہے دستیاب ہو سکے۔ قلمی تھی۔ مگر اس کی بکثرت نقلیں ہوئی تھیں۔ برکت، جزل کرنلونی کے پیش کار تھے۔ مومن سے بڑا یارانہ تھا۔ عمر میں مومن سے بڑے تھے۔ مگر مومن کی نباضی اور نباضی سے زیادہ شعر میں کمال نے برابر کا یار بنا دیا تھا۔ مومن نوجوان تھے۔ یہ باراں دیدہ۔ انہوں نے ذرا سی بات کہی یہ تہ تک پہنچ گئے۔ برکت کی مثنوی مومن کے عشق کی پوری پوری روئداد تھی۔ امت الفاطمہ عنفوان شباب میں شادی کے دوسرے تیسرے سال بیوہ ہو گئیں تھیں۔ ایک ڈپٹی صاحب سے متعہ ہوا۔ اندارے کنویں کے عین سامنے (قاسم جان کی گلی میں) ایک اونچا پھاٹک آپ نے دیکھا ہوگا۔ وہ پھاٹک انہیں ڈپٹی صاحب کے گھرانے کی یادگار ہے۔ ڈپٹی صاحب سے بھی برکت کا یارانہ تھا۔ معالجے کے سلسلے میں وہی جو تقریب ہوئے۔ امت الفاطمہ حسن و جمال میں فرد تھیں۔ متعے کا فیضان کچھ ایسا ہوا کہ آئین ہم آغوشی میں طاق ہو گئیں۔ وہ لوہن تھیں جن پر مومن چھوٹے اور پھر ہو گئے۔ پھر مومن کا معاملہ تو یہ تھا کہ عین شباب میں عالم آشوب نگاہے سراہم بگرفت۔ سید احمد شہید کے مرید ہو گئے اور بے چاری امت الفاطمہ صاحب ہی خانگی بن گئی۔ عشق مومن کی داستان قول غمیق نہیں بلکہ برکت کی مثنوی ہے اس سے اندازہ فرمایئے کہ پانسو بیت میں کیا کیا ہوگا۔[3]

---

[1] گلشن بے خار بذکر صاحب جی۔ [2] مومن اور مطالعہ مومن ص ۵۳ [3] مومن اور مطالعہ مومن ص ۵۴

سوال یہ ہے کہ مولانا ابوالخیر مودودی صاحب کے بیان کو مستند کیونکر تسلیم کیا جائے۔ جبکہ وہ خود یہ فرماتے ہیں کہ "بیاض سالک تو ناقابل یافت ہے۔ اور برکت خیرآبادی کی مثنوی ممکن ہے دستیاب ہو سکے"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بیاض سالک یا برکت خیرآبادی کی مثنوی اب تک کسی کی نظر سے نہیں گذری۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ مولانا نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے وہ برکت خیرآبادی کی مثنوی کا خلاصہ ہے تو اس سے یہ کہیں مستنبط نہیں ہوتا کہ امت الفاطمہ صاحب جی محمد حسین آزاد کی عزیزہ تھیں۔ محض اس قیاس پر کہ امت الفاطمہ چونکہ مذہباً شیعہ تھیں اور آزاد بھی شیعہ تھے۔ اس لئے امت الفاطمہ ضرور ان کی عزیزہ رہی ہوں گی۔ کسی طرح درست خیال نہیں کیا جا سکتا۔ اول تو اب تک ایسا مستند حوالہ نہیں ملا جس سے یہ ثابت کیا جائے کہ امت الفاطمہ فی الواقع شیعہ تھیں۔ دوسرے یہ کہ اگر ان کا شیعہ ہونا ثابت بھی ہو جائے تو انہیں آزاد کی عزیزہ کہنے کی کیا دلیل ہے۔ مولانا کے اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مومن سب سے پہلے صاحب جی کے عشق میں گرفتار ہوئے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ مومن یقیناً اس سے پہلے کم از کم دو بار دام عشق میں گرفتار ہو چکے تھے اور بڑی شکلیں اٹھائی تھیں۔ جیسا کہ ان کے پہلی مثنوی شکایت ستم سے واضح ہے۔

مثنویوں کی تفصیل میں بتایا جا چکا ہے۔ مومن نے امت الفاطمہ کے معاشقے کے علاوہ بھی کئی پردہ نشینوں اور زہرہ جبینوں سے دل لگایا تھا۔ ان میں ایک محبوبہ کا تعلق یقیناً شیعہ گھرانے سے بھی تھا۔ غزل کے متفرق اشعار اور مثنوی گریہ و زاری مظلوم میں مومن نے خود نہایت صراحت سے یہ بتا دیا ہے کہ ان کی ایک محبوبہ مذہباً شیعہ تھیں اور اسی اختلاف عقیدہ کے سبب وہ اک جان دو قالب ہو کر ایک جگہ نہ رہنے پائے۔ اس سلسلے میں مثنوی گریہ و زاری کے چند اشعار دیکھئے۔ جن میں انہوں نے اپنے ایک محبوبہ کے عقاید کا ذکر کیا ہے۔

نرالا سب سے اس کا کیش و آئیں — محب اہل بیت و دشمن دیں
غضب خونریز کافر ماجرا ہے — فضائے خانہ دشت کربلا ہے
طلسم شیعگی جادو کلامی — صفت میری جو ہو تو نیک نامی
مری الفت چھپائے مجھ سے بے دیں — تقیہ فرض جانے مستحب کیں

یہ شیعہ خاتون مہذب و تعلیم یافتہ تھیں۔ اور عقائد کے سلسلے میں اکثر مومن سے ردوکد رہا کرتی تھی۔ چنانچہ مومن کو انہیں اپنا ہم خیال بنانے کی بڑی آرزو تھی۔

نکالے عرض ایماں مطلب اپنا — کروں آخر اسے ہم مذہب اپنا
پڑھے کلمہ میرا وہ نامسلماں — مبارک باد دیں کیا کیا مسلماں
ادا ہو احتساب پاک ساقی — بنے دیندار کافر ماجرائی

لیکن شاید مومن کی یہ آرزو پوری نہیں ہوئی۔ اس لئے کہ مومن نے اپنے ایک منظوم خط میں محبوب کے ان عقاید کی طرف دوبارہ اشارہ کئے ہیں اور محرم کے زمانے میں بھی اسے غم ناک و نم دیدہ دیکھنے کی تاب نہیں لا سکے۔ کہتے ہیں۔

یعنی از بس محرم آیا — ہنگام دفور ماتم آیا
تھا غم ترا دل کو ناگوارا — اس فکر نے مجھکو جاں سے مارا
ہر چند غم امام ہووے — پر تجھ کو نہ غم سے کام ہووے

اسی طرح مومن کی غزلوں میں کئی شعر اس طرح کے مل جاتے ہیں۔ جن سے ان کی ایک محبوبہ کا شیعہ ہونا ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً یہ اشعار دیکھئے۔

سینہ کوبی سے نہ میں ساری ہلا کر اٹھے — کیا علم دھوم سے تیرے شہدا کے اٹھے
سوزندگی نثار کروں ایسی موت پر — یوں روئے زار زار تو اہل عزا کے ساتھ
دل ایسے شوخ کو مومن نے دیدیا کہ وہ ہے — محب حسین کا اور دل رکھے شمر کا سا

اس قسم کے اشعار سے یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ مومن ایک شیعہ خاتون پر بھی عاشق تھے۔ لیکن اس سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ یہ شیعہ خاتون آزاد کی عزیزہ یا امت الفاطمہ صاحب جی ہی تھیں۔ مومن نے "قول غیور" میں صاحب جی کی داستان محبت کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ لیکن اس میں کہیں بھی صاحب جی کے عقاید پر کوئی بحث نہیں کی۔ صرف ایک شعر میں ایک لفظ آیا ہے جس سے شبہ ہوتا ہے کہ امت الفاطمہ شیعہ تھیں۔

منہ کو مومن سے چھپانا کافر — یہ تقیہ تو نہ بھایا کافر

لیکن امت الفاطمہ کو شیعہ ثابت کرنے کے لئے یہ دلیل کافی نہیں ہے۔ اس لئے مومن اپنی مثنویوں میں خاص طور پر مثنوی، گریہ وزاری مظلوم میں جس محبوبہ کے شیعی عقاید کا ذکر کیا ہے اس کے متعلق یہ بات قطعاً واضح کر دی ہے کہ وہ صاحب جی کے علاوہ کوئی اور خاتون ہیں ایک شعر دیکھئے۔

نہ تھے صاحب کہ نکلے بے وفا تم — کہو میں بھاگتا ہوں یا کہ تم

ایسی صورت میں یہ قیاس کرنا کہ صاحب جی یقیناً شیعہ تھیں درست نہیں معلوم ہوتا۔ مولانا ابوالخیر مودودی کے خط کا جو اقتباس پچھلی سطور میں دیا گیا ہے اس میں امت الفاطمہ کو شیعہ بتایا گیا ہے۔ اور ان کے متعہ کی داستان بھی درج کی گئی ہے۔ لیکن جب تک کوئی مستند مخطوطہ ہاتھ نہ آئے۔ مولانا کے بیان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ مومن نے جس شیعہ محبوبہ کا مفصل ذکر اپنی مثنوی میں کیا ہے۔ اس کے متعلق انہوں نے صاف کہدیا ہے کہ وہ صاحب جی نہیں ہیں۔ ایسی صورت میں امت الفاطمہ کو شیعہ خیال کرنا اور محض شیعت کی بنا پر انہیں آزاد کی عزیزہ تسلیم کرنا مشکل ہے۔

مومن کی چوتھی مثنوی تف آتشیں میں مومن کی جن نئی محبوبہ کا ذکر آیا ہے اس کے متعلق صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ وہ انہیں کے ہم نسبوں اور ہم مذاقوں کے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔

یعنی ہمارے ہم ہنروں میں — ہم نسبتوں میں ہم گہروں میں
شادی اٹھی اک گھر میں شتابی — اس میں ہوئی یہ خانہ خرابی
پردے سے اک آواز خوش آئی — جس نے یہ چپ ہے مجھ کو لگائی

یہاں اس بات کی طرف اشارہ تو موجود ہے کہ محبوبہ کسی شاعر یا ادیب کے یہاں شادی کی تقریب میں آئی ہوئی تھیں اور اس لئے ممکن ہے کہ وہ رشتہ قرابت کی وجہ سے شادی میں آئی ہوں۔ لیکن ان پر امت الفاطمہ یا آزاد کی عزیزہ کا گمان نہ کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ مثنوی میں کوئی ایسا قرینہ موجود نہیں ہے۔

پانچویں مثنوی حسین منوم میں جیسا کہ ابتدا میں بتایا جا چکا ہے۔ ایک نئے معاشقے کا ذکر معلوم ہوتا ہے۔ لیکن مثنوی کے اس شعر سے

مضطرب رکھنے لگی آوارگی — صاحبی اور اس قدر بے چارگی

صاف اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس میں صاحب جی کے معاشقے کو از سر نو دوسرے پیرائے میں سنایا گیا ہے۔

چھٹی مثنوی "گریہ وزاری مظلوم" میں بھی کوئی نئی داستان نہیں ہے۔ اس مثنوی کے مطالعے سے اس بات کا یقین ضرور ہو جاتا ہے کہ مومن کے چار عشقیہ افسانوں میں سے کسی ایک کی ہیروئن کوئی شیعہ خاتون ضرور تھیں۔ پچھلی سطور میں اس مثنوی کے کئی ایسے اقتباس دے چکے ہیں جن میں مومن نے محبوبہ کے عقاید پر بحث کی ہے۔ لیکن جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے اس شیعہ محبوبہ پر امت الفاطمہ یا آزاد کی عزیزہ کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اس لئے امت الفاطمہ کے شیعہ ہونے اور آزاد سے رشتہ قرابت رکھنے اور آزاد کا آب حیات سے مومن کو خارج کر دینے کی روایت بے بنیاد نظر آتی ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ آزاد نے مومن جیسے نامور شاعر کو آب حیات کے پہلے اڈیشن میں کیوں جگہ نہ دی۔ اس کے متعلق مزید تحقیق و تلاش کی ضرورت ہوگی۔ امت الفاطمہ کو شیعہ کہنے اور آزاد کی عزیزہ بنانے سے کام نہیں چلتا۔ اس لئے کہ مومن نے خود اس کی تردید کر دی ہے۔

نوراللغات اور فرہنگِ اثر

(بہ سلسلہ ماسبق)

(طاہر محسن کاکوروی)

نوراللغات ــــ آگے ناتھ نہ پیچھے پگھا۔ (ناتھ۔ نکیل۔ پگھا جوتی کا تسمہ) پوری مثل یہ ہے آگے ناتھ نہ پیچھے پگھا سب سے اچھا دھوبی کا گدھا۔ (عو) لاوارث۔ لاولد کی نسبت بولتے ہیں جس کا کوئی پوچھنے والا نہ ہو۔

فرہنگِ اثر ــــ پگھا کے معنی غلط تحریر کیے گئے۔ پگھا یا پگا وہ رسّی ہے جو بیل کی گردن سے لے کر دُم تک باندھی جاتی ہے۔ (دیکھئے پلیٹس نیز فیلن) زیادہ تر پگا بولتے ہیں، فیلن میں پگھا درج نہیں۔

طاہر ــــ امیراللغات میں آگے ناتھ نہ پیچھے پگھا ہے۔

نفس اللغہ۔ "آگے ناتھ نہ پیچھے پگھا"

بہارِ ہند۔ "آگے ناتھ نہ پیچھے پگھا"

ارمغانِ دہلی۔ "آگے ناتھ نہ پیچھے پگا" محاورہ۔ (ا) "ناک میں ناتھ نہ پاؤں میں پچھاڑی"

مخزن المحاورات۔ "آگے ناتھ نہ پیچھے پگا"

اس سے پتہ چلتا ہے کہ پگھا کے ساتھ یہ مثل لکھنؤ میں بولتے ہیں۔ اور پگا کے ساتھ بغیر ہائے مخلوط دہلی والوں کی زبان پر ہے۔ معنوں میں سب سے مختلف ہیں۔

امیراللغات۔ سرمایۂ زبان اُردو۔ بہار ہند نے معنی کچھ نہیں بتائے۔ نوراللغات میں دیا ہے۔ (ناتھ نکیل۔ پگھا جوتی کا تسمہ) ارمغانِ دہلی نے پگا لکھ کر۔ لکھا ہے۔ "ناک میں ناتھ نہ پاؤں میں پچھاڑی"۔ فیلن لکھتا ہے۔ پگا۔ پگھا۔ فیلن کے یہاں پگا اور پگھا دونوں ہیں۔ معنوں میں فیلن اور فوربس کے یہاں خود ہی اختلاف ہے۔ فیلن میں جو میرے پاس ہے، پگا کے بعد یقینی پگھا درج ہے۔ جناب اثر کے پاس جو فیلن کی ڈکشنری ہے، ممکن ہے اس میں درج نہ ہو۔

نوراللغات ــــ آم پال رکھنا یا ڈالنا۔ ایک قاعدۂ خاص سے کچے اور گدرائے آموں کا بھوس وغیرہ میں رکھ دینا تاکہ پک جائیں۔

فرہنگِ اثر ــــ ہم آموں کی پال رکھنا یا ڈالنا بولتے ہیں۔

طاہر ـــ امیر اللغات - بہار ہند وغیرہ میں مثل نور اللغات آم پال رکھنا یا ڈالنا ہی درج ہے - پال مونث ہے اور یہاں تانیث و تذکیر کا ذکر ہی نہیں پھر حضرت اثر نے یہ تخصیص یہاں معلوم نہیں کیوں فرمائی۔

نور اللغات ـــ آم کھائے پال کا خربوزہ کھائے ڈال کا پانی پیئے تال کا - یہ جملے بطور کلیہ کے ضرب المثل کی طرح زبانوں پر ہیں۔

فرہنگ اثر ـــ نہ معلوم کہاں ہیں - لکھنؤ میں تو اس طرح زباں زد ہیں - آم کھائے ڈال کا پانی پیئے تال کا - آم کھائے ٹپکا، پانی پیئے ڈبکا - علاوہ بریں اول تو خربوزے کے ساتھ پانی پیا ہی نہیں جاتا - دوسرے خربوزے میں ڈال کہاں اس کی بیل زمین پر پھیلی ہوتی ہے۔

طاہر ـــ امیر اللغات - بہار ہند - نور اللغات کی تائید میں ہیں - یہ بھی خوب حکم ہے کہ خربوزے کے ساتھ پانی پیا ہی نہیں جاتا حضرت وہ تربوز ہے جس کے ساتھ پانی پینے کی ممانعت تھی - دوسرے اس ضرب المثل کا مطلب جہاں تک سمجھ میں آیا ہے یہ ہے کہ آم تخمی پال ہی کا اچھا ہوتا ہے - اور خربوزہ بجائے پال کے ڈال (بیل) کا اور پانی تال ہی کا مفید ہوتا ہے صحت کے لئے۔

چنانچہ امیر اللغات میں ہے کہ آم پال کا اور خربوزہ تازہ ٹوٹا ہوا ڈال کا اچھا ہوتا ہے اور پانی دریا کا خوشگوار ہوتا ہے - اسی طرح آم کے آم گٹھلی کے دام - نور اللغات کی تائید میں ہے اور یہ مشہور شعر سند میں ہے ؎

اس تجارت سے فایدہ ہے تمام دام گٹھلی کے اور آم کے آم

فرہنگ اثر ـــ یہ معلوم ہوا کہ "مثل میں گٹھلی بجائے صیغۂ واحد صیغۂ جمع میں ہے - گٹھلیوں کے دام بہار ہند وغیرہ نور اللغات کی تائید میں ہیں - ممکن ہے دہلی میں آم کے آم گٹھلیوں کے دام بولتے ہوں جیسا کہ ارمغان دہلی نے دیا ہے، لیکن سند نہیں پیش کی۔

نور اللغات ـــ آم میں مور آنا، آم کے پیڑ کا پھولنا۔

فرہنگ اثر ـــ لکھنؤ میں بور آنا بولتے ہیں نہ کہ مور آنا - پلیٹس میں بھی آم کے ساتھ بور آنا لکھا ہے نہ کہ مور آنا۔

طاہر ـــ امیر اللغات - آم میں مور آنا - (ہلال) ؎

کیوں ہوا جوشِ جنوں پھر آگئی فصلِ بہار مور آیا آم میں پھولا ہوا ہے ڈھاک سُرخ

جامع اللغات - آم کا کہر یا مور - آم کے باریک باریک پھول - دیکھئے آرائش محفل "ٹیسو پھولا آمبوا مورائے"

نفس اللغۃ میں جناب رشک فرماتے ہیں - مور - بفتح میم بروزن جور - گل انبہ باشد کہ ازاں انبہ پیدا شود۔

نور اللغات ـــ کے صفحہ ۱۰۹ پر الف ممدودہ میں آنتیں گلے پڑنا لکھا ہے اور الف مقصورہ کے باب میں صفحہ ۳۳۵ پر الٹی آنتیں گلے پڑنا لکھا ہے۔

فرہنگ اثر ـــ لکھنؤ میں الٹی آنتیں گلے پڑنا بولتے ہیں اس طرح درج نہیں۔

طاہر ـــ حضرت اثر سے ہم کو ہرگز یہ امید نہ تھی کہ وہ الف ممدودہ کے الفاظ پر اعتراض کرتے کرتے اپنی دھن میں الف مقصورہ کے الفاظ بھی اسی میں شامل کر دیں گے - اگر حضرت اثر نے نور اللغات کے صفحہ ۳۳۵ پر نظر ڈال لی ہوتی تو ان کو یہ لکھنے کی زحمت نہ گوارا کرنا پڑتی کہ الٹی آنتیں گلے پڑنا درج نہیں - اسی طرح بہت جگہ کہا گیا

ہے۔ اسی طرح آنت سانٹ کے بارے میں حضرت اثر نے فرمایا کہ لکھنؤ میں اس کو سانٹ کا سانٹھ بولتے ہیں۔ ملاحظہ ہو نور اللغات جلد دوم کے صفحہ ۲۷۸ پر سانٹ گانٹھ۔ مونث۔ سازش۔ دہلی میں اس جگہ آنٹ سانٹ مستعمل ہے۔

نور اللغات — آن میں کچھ ہے آن میں کچھ ہے۔ متلون مزاج کی نسبت کہتے ہیں کہ اس کے قول و فعل کا کچھ اعتبار نہیں۔ گھڑی بھر میں کچھ ہے گھڑی بھر میں کچھ ہے۔ (درد) ؎

دل بھی تیرے ہی ڈھنگ سیکھا ہے آن میں کچھ ہے آن میں کچھ ہے

فرہنگ اثر — انسان پر موقوف نہیں کوئی شے جو جلد جلد تغیر پذیر ہو اس کی نسبت کہتے ہیں۔ بقول مرزا شوق ؎

ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے یہی دنیا کا کارخانہ ہے

طاہر — حضرت اثر کے فرمانے سے شوق کے شعر کو آن میں کچھ ہے آن میں کچھ ہے۔ تسلیم کر لیا جائے تو اور بات ہے ورنہ یہ شعر اس کی سند میں تو نہیں پیش کیا جا سکتا۔ اور یہاں اس کا پیش کرنا کوئی معنی بھی نہیں رکھتا۔

نور اللغات — (ھ۔ س) آندو۔ زنجیر۔ (ادی باندھنا) مذکر زنجیر جسے نامی پہلوان کشتی جیتنے کے بعد پاؤں میں پہنتے ہیں۔ یہ ہم پیشہ لوگوں پر غلبے اور استادی کا نشان سمجھا جاتا ہے۔ (شعور) ؎

مجھ سا نہیں دیوانوں میں تیرے کوئی بانکا آندو ہے میرے پاؤں میں زنجیر نہیں ہے

ملاحظہ ہو ضمیمہ۔ وہ رسّا یا زنجیر جو مست ہاتھی کے پاؤں میں باندھتے ہیں۔

فرہنگ اثر — آندو (واؤ معروف) وہ رسّا یا زنجیر جو ہاتھی کے پاؤں باندھی جاتی ہے۔ موٹی اور بھاری ہونے کا مفہوم مضمر ہے۔ شعر کا حاصل یہ ہوا کہ تیرے دیوانوں (عاشقوں) میں میرا مدِ مقابل کوئی نہیں اور دیوانے بھی پا بہ زنجیر ہوتے ہیں، میں ان میں پیل دماں ہوں۔ یہ حضرت مصنف کی خیال آرائی ہے کہ آندو وہ زنجیر ہے جسے پہلوان کشتی جیتنے کے بعد پاؤں میں پہنتے ہیں۔ فیلن میں صاف صاف لکھا ہے کہ آندو وہ زنجیر یا رسّی ہے جو ہاتھی کے پاؤں میں باندھی جاتی ہے۔ پہلوانی کا کوئی ذکر نہیں۔

طاہر — امیر اللغات۔ آندو۔ (ھ) آندُو۔ زنجیر۔ س۔ مادّہ۔ اَدی۔ باندھنا ہے۔ (بعض کا قول ہے کہ آندُو الف ممدودہ کے ساتھ بھی سنسکرت میں مستعمل ہے) مذکر چاندی وغیرہ کی زنجیر کو کہتے ہیں۔ جسے پہلوان کوئی نامی کشتی نکالنے کے بعد پاؤں میں پہنتے ہیں جو ہم پیشہ لوگوں پر غلبے اور استادی کا نشان سمجھا جاتا ہے۔

تذکیر و تانیث۔ حضرت جلیل۔ آندو۔ مذکر پہلوانی اور بہادری کا امتیازی نشان۔

جامع اللغات۔ (۱) زنجیر جو ہاتھی کے پاؤں میں باندھتے ہیں۔ (۲) پازیب یا زنجیر جو پہلوان کشتی جیتنے کے بعد استاد کے نشان کے طور پر باندھتے ہیں۔ (۳) پازیب۔

نور اللغات — آنڈو۔ (س) مذکر۔ کڑا۔ (قدر) ؎

کاٹ کر غیروں کے سر لائے جو میری نذر کو ڈالدوں سونے کا آنڈو پاؤں میں جلاد کے

۲ سانڈ۔ ۳ (ملاحظہ ہو ضمیمہ نور اللغات بڑے بیضوں والا)

فرہنگ اثر — آنڈو بمعنی کڑا کوئی لفظ نہیں - یہ غالباً وہی آندو ہے (دال مہملہ) جسے بربنائے غلط کتابت آنڈو پڑھا گیا۔ داؤ معروف ہے - دیکھئے فیلن۔

ظاہر — آنڈو - یقیناً ایک لفظ ہے - آندو سے اس کا کوئی علاقہ نہیں - دیکھئے فیلن کی ڈکشنری میں صفحہ ۵۴ ابد

اور فوربس کی ڈکشنری میں صفحہ ۶۷ پر _____ (قدر) کے شعر میں آنڈو کے معنی کیا ہیں یہ زیر بحث ہے - مؤلف نورالنغات نے (کڑے) کے معنی ضرور اپنی سمجھ کے مطابق لکھے اور اس شعر سے یہی معنی مطابقت بھی رکھتے ہیں۔

جامع اللغات - آنڈو (ہ - صفت) ۱ فوطوں والا - ۲ بڑے فوطوں والا ۳ مذکر کڑا - ۴ سانڈ نر بیل - مثل آنڈو بیل جی کا جوال (ھ) سانڈ جنجال ہوتا ہے۔

نورالنغات — آنکھ یا آنکھیں پھڑکنا - لازم - خود بخود پلک یا پپوٹے میں حرکت ہونا - مشہور ہے کہ مرد کی داہنی اور عورت کی بائیں آنکھ پھڑکے تو کوئی بچھڑا ہوا ملے - اور مرد کی بائیں اور عورت کی داہنی آنکھ پھڑکے تو صدمہ پہونچے - بعض کہتے ہیں کہ تخصیص مرد عورت کی داہنی بائیں آنکھ کی ٹھیک نہیں ہے بلکہ باعتبار اس شگون کے کسی کی داہنی آنکھ اچھی ہوتی ہے اور کسی کی بائیں - (نجر) ؎

الٰہی اپنی بغل میں مو دیکھوں آج اسے — یہ بائیں آنکھ پھڑکتی ہو نیک فال مجھے
(صبا) تقدیر شکل ہجر کی تکتی ہے وصل میں — رہ رہ کے بائیں آنکھ پھڑکتی ہے وصل میں

ثر اثر — یہ سوائے آنکھ (واحد) کے آنکھیں جمع کے ساتھ استعمال نہیں ہوتا - حقیقت بھی یہی ہے کہ ایک وقت میں صرف ایک آنکھ پھڑکتی ہے اور اسی سے شگون لیا جاتا ہے - البتہ ہندی میں "انکھیاں پھڑکن لاگیں" (بسبب شدت انتظار)

ظاہر — امیراللغات - آنکھ یا آنکھیں پھڑکنا - (نصیر) ؎

آنکھ جب پھڑکے ہے بائیں تب مجھے کہتا ہے وہ — کچھ خوشی دکھلائے گا یہ اضطراب نرگسی
(صبا) تقدیر شکل ہجر کی تکتی ہے وصل میں — رہ رہ کے بائیں آنکھ پھڑکتی ہے وصل میں

محققین اس کو امراض باردہ پیدا ہونے کی علامت جانتے ہیں - اور اطبا اس کی علت ریاح کی حرکت قرار دیتے ہیں اور یہی ٹھیک ہے - اور اس سے شگون بھی لیتے ہیں یہ کچھ ہندوستان کا اختراع نہیں ہے بلکہ عرب میں بھی اس کا پتہ ملتا ہے۔

بہار ہند - آنکھ پھڑکنا یا آنکھیں پھڑکنا - دونوں طرح بولتے ہیں - پلک میں حرکت ہونا - خود بخود پپوٹے کا حرکت کرنا۔

نور اللغات ـــــ آنکھ مچولا - لڑکوں کا کھیل - ایک لڑکے کی آنکھ بند کرکے اور سب لڑکے چھپ جاتے ہیں پھر وہ آنکھیں کھول کے ڈھونڈھتا پھرتا ہے جسے پاکر چھو لیتا ہے اس کو آنکھیں بند کرکے بیٹھنا پڑتا ہے - (ہلال) ؎

موت آنکھیں مری کرتی ہے بند آپ نہ چھپئے — یہ کھیل نہیں آنکھ مچولا نہ سمجھئے

دہلی میں آنکھ مچولی بھی کہتے ہیں - (داغ) ؎

غیر کو گھر میں چھپایا مری آنکھیں ڈھانکیں — کھیل یہ آنکھ مچولی کا نرالا دیکھا

انشاء نے آنکھ مچول بھی کہا ہے ؎

ہے تب مزہ کہ آنکھ مچول کے کھیل میں — ہمسن کئی ہوں لڑکے پری اس صنم کے ساتھ

فرہنگ اثر ـــــ نہ صرف صاحب نور اللغات بلکہ حضرت جلال لکھنوی نے بھی آنکھ مچولا کو لکھنؤ سے مخصوص کیا ہے، حالانکہ جہاں تک میرا مطالعہ اور تجربہ ہے (اور ایک عمر کا تجربہ) لکھنؤ میں آنکھ مچولی (شاذ آنکھ مچول) کے سوا آنکھ مچولا سننے میں نہیں آیا - ایک زمانہ میں چھوٹی لڑکیاں کھیل کے وقت گاتی پھرتی تھیں "میں آنکھ مچولی کھیلوں گی" - انشاء نے شعر ہی میں آنکھ مچول نظم نہیں کیا ہے بلکہ دریائے لطافت میں بھی "آنکھ مچول" بچوں کا کھیل تحریر کیا ہے -

طاہر ـــــ ملاحظہ ہو امیر اللغات صفحہ ۲۳۶ کالم دو پر آنکھ مچولا اور اس کی تفصیل - بہار ہند - "آنکھ مچولا بچوں کا کھیل ہے" - میر و میرزا کے زمانہ آنکھ مچول بھی بولتے تھے - اور دہلی میں ابتک آنکھ مچولی بولتے ہیں - (رشک) ؎

سچ مچ اے اہل نظر آنکھ مچولا نظر آیا" نفس اللغہ (آنکھ مچولا - بازی طفلاں کہ چشم یکے بند کنند و ہمہ ہا بجا ہا پنہاں شوند و چشم آنکس وا کند و ہمہ تلاش کند او ہر کس را بگیرد آں وزد شود - چشمہائے او بند کردہ شود (ف) - سرمالک و چشم بندک)

ہم لایق محقق حضرت اثر کے وسیع مطالعہ اور تجربے کے بارے میں تو کچھ عرض نہیں کر سکتے لیکن غریب انشاء کے لئے اتنا ضرور کہیں گے کہ آنکھ مچولا (بقول حضرت اثر شاذ آنکھ مچول) کو اپنے کلام میں اور نیز دریائے لطافت میں لکھ کر اپنے آپ کو اتنے بڑے محقق اور تجربہ کار کی نظروں سے ضرور گرا دیا -

نور اللغات ـــــ آنکھ کی کیچڑ - وہ کثافت جو آنکھ کے گوشوں میں جمع ہوتی ہے -

فرہنگ اثر ـــــ نور اللغات میں سرمایۂ زبان اردو کے تتبع میں کیچڑ کو مونث درج کیا ہے - حالانکہ کیچڑ کو کثافت چشم کے معنی میں مذکر بولتے ہیں - اس کی آنکھوں میں کیچڑ آتا ہے نہ کہ آتی ہے - (عام طور پر لفظ کیچڑ مونث ہے صرف آنکھوں کے ضمن میں مذکر بولا جاتا ہے)

طاہر ـــــ امیر اللغات - آنکھ کی کیچڑ - وہ کثافت جو آنکھ کے گوشوں میں جمع ہوتی ہے -

بہار ہند - آنکھ کی کیچڑ - وہ کثافت جو آنکھ کے گوشوں میں زردی مایل جمع ہو جاتی ہے -

جامع اللغات - آنکھ کی کیچڑ - وہ میل یا کثافت جو آنکھ کے کونوں میں جمع ہو جاتی ہے -

نور اللغات ـــــ آنکھوں سے مجبور - آنکھوں سے معذور، اندھا - (کرنا - ہونا کے ساتھ) - (مسرور) ؎

ہوا پنہاں جو اس کا چہرۂ پر نور آنکھوں سے • یہاں تک روئے عاشق ہو گئے مجبور آنکھوں سے

نور اللغات — آہو کا کالا ہونا۔ ہرن کا سیاہ ہو جانا۔ کنوار کی سخت دھوپ میں ہرن کالا ہو جاتا ہے۔ (ناسخ)

گرمیٔ رخسار سے بیمار ہوگی چشم یار دھوپ کی شدت سے آہو کالا ہو جائے گا

فرہنگ اثر — یہ محض قیاس آرائی یا عقلی گدا ہے۔ آہو اور دھوپ کی شدت کی بنا پر کالا کے معنی ہرن کا سیاہ یا کالا ہو جانا فرض کر لئے گئے۔ "بیمار ہوگی چشم یار" کا فقرہ ناقابل اعتنا ٹھہرا۔ لفظ آہو مجازاً بمعنی چشم یار استعمال ہوا ہے دھوپ کی شدت گرمیٔ رخسار ہے چشم معشوق کی ایک صنعت "بیمار" بھی ہے، شعر کا مطلب ہے کہ تابش رخسار دوست کا یہی عالم ہے تو چشم سیاہ یار میں صفت بیمار کا بھی اضافہ ہو جائے گا۔ لطف یہ ہے کہ ہائے ہوز کے تحت صاحب نور اللغات نے لفظ کاہلا کے وہی معنی لئے ہیں جو میں نے عرض کئے۔ یعنی بیمار نہ کہ سیاہ یا کالا۔ وہاں ان کی عبارت یہ ہے۔ ہرن کا کاہلا ہونا۔ گرمی کی شدت یا آفتاب کی حدت سے ہرن کا سست پڑ جانا۔ (ناسخ) کا وہی مذکورۂ بالا شعر۔ اسی شعر میں لفظ کاہلا کے معنی ایک جگہ کالا یا سیاہ اور دوسری جگہ سست یا بیمار!۔ کاہلا بمعنی بیمار پلیٹس میں درج ہے۔ فرہنگ شفق میں بمعنی سست ہے۔ پلیٹس نے اسے عربی لغت قرار دیا ہے مگر اسکی تصدیق نہ ہو سکی۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ کاہل کی مہند صورت ہے جس میں کاہلی یا سستی کے ساتھ ناسازی مزاج کا عنصر بھی شامل ہے۔ صاحب نور اللغات نے اُسے ہندی قرار دیا ان کے قول کی صحت بہت مشتبہ ہے فیلن میں درج نہیں۔ شیکسپیر نے بھی اسے عربی قرار دیدیا ہے اور کاہل سے استخراج کیا ہے۔

طاہر — نفس اللغۃ۔ کاہلا۔ ھ۔ سست و ماندہ۔ چنانکہ میگویند کہ ہرن دھوپ سے کاہلے ہو جاتے ہیں یعنی تابش آفتاب انیقدر می آید کہ آہو باوجود طاقت ماندہ میشود"۔ امیر اللغات۔ آہو کا کاہلا ہونا۔ ہرن کا سیاہ ہو جانا کنوار کی سخت دھوپ میں ہرن سست اور کالا ہو جاتا ہے۔ (شعر ناسخ) مذکورۂ بالا نور اللغات۔

جامع اللغات۔ آہو کا کاہلا ہو جانا یا ہونا۔ (لازم) ہرن کی مینگھ کا سیاہ ہو جانا۔ اسوج کے مہینہ کی سخت دھوپ کا اثر ہوتا ہے۔ غورلیس۔ کاہلا (عربی) بہ معنی ناساز۔ بیمار۔ دکھی۔

نور اللغات۔ ھ۔ کہلنا۔ بریاں کرنا۔ اور کہلانا۔ ھ سے کاہلی کرنا۔ ناسخ کے شعر میں ہے کہ معشوق کی آنکھ رخسار کی گرمی سے ایسی بیمار ہو گئی جیسے دھوپ کی تابش یا تیزی سے ہرن کاہلا یعنی دکھی یا سست ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب اچھا بھلا آدمی یا جانور بیمار ہوتا ہے یا زیادہ دنوں تک کسی گرم مقام پر رہتا ہے تو وہ سست ہو جاتا ہے اور اس کا رنگ بھی گرمی کی وجہ سے کالا نہیں تو ماند ضرور پڑ جاتا ہے۔ ایسا ہی نفس اللغہ کے الفاظ سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ لہذا اس کا عربی سے لیا جانا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ میرا خیال ناقص یہ ہے کہ عربی کاہل سے کاہلا نہیں بنا بلکہ ہندی مصدر کہلانا یا کہلنا سے بنا لیا ہے۔ اکثر بولتے ہیں کہ دھوپ میں پھرتے پھرتے رنگ کہلا گیا۔ یا جیسے تاش، مونگ کہل لو۔ اسی طرح ہرن دھوپ میں کاہلا ہو گیا۔ کنایۃً بمعنی کالا آسکتا ہے۔

نور اللغات — اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ (عم۔ مثل) موقع ہاتھ سے نکل گیا تو پچھتانے سے کیا حاصل۔

فرہنگ اثر — مثل عام طور پر یونہیں مشہور ہے۔ خزینۃ الامثال میں اس طرح درج ہے۔ "اب پچھتائے ہوت کیا جب

چڑیاں چگ گئیں کھیت" ایک لفظ "ہے" کم کردینے اور نشست الفاظ میں خفیف تغیر (ہوت کیا بجائے کیا ہوت) کردینے سے مثل کی روانی اور ترنم میں کتنا اضافہ ہوگیا۔ ہاں ایک بات اور ہے۔ صحیح چڑیا بالکسر اول ہے۔ اس مثل میں بضم اول پڑھئے اور چگ میں صوتی توازن قایم رہے۔

طاہر — امیراللغات میں یہ مثل نورالغات کے مثل دی ہے اور بہار ہند میں بھی۔ نذیر احمد نے اپنے مجموعہ لکچرز میں بھی ایسے ہی لکھی ہے۔ ایک طرح سے یوں بھی سنی ہے پچھتائے (کا) بجائے کیا ہوت (ہے ندارد) جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ چڑیاں کی (چ) بجائے بالکسر بضم چُڑیاں پڑھنے سے ترنم کا پیدا ہونا واقعی نئی بات ہے اور چگ میں صوتی توازن قایم رکھنے کے لئے چُڑیاں کھیت میں دانہ چگ رہی ہیں۔ چڑیاں کو چڑیاں ہی پڑھا جائے جہاں اس کے آگے لفظ کو پیش ہو۔ اگر یہی رائے مناسب ہو تو اسی پر فتوے اہل زبان زباندان صادر فرمادیں۔

نورالغات — لم برا۔ لمبے پر والا۔

فرہنگ اثر — میرے کان اس سے آشنا نہیں اور اس کی صحت مشتبہ ہے جب تک کسی لکھنؤ والے کی تحریر سے مثال نہ پیش کیجائے۔

طاہر — حضرت اثر کے کان لمپرا سے آشنا نہیں اس کو بیچارے مؤلف نورالغات کیا کریں۔ ملاحظہ ہو (میر علی اوسط رشک کی نفس اللغہ جو خالص لکھنوی ہے) "لمپرا۔ ف۔ دراز پر"۔ گستاخی معاف اگر ہمارے فاضل محقق مدظلہ کبوتر بازی کا شوق رکھتے ہوتے یا کبوتر بازوں سے ربط ضبط ہوتا تو لمپرا کے ساتھ ساتھ کمپرا اور کبھی کبھی گھٹ پرا سے بھی اُن کے کان آشنا ہوجاتے۔

نورالغات — بالم کھیرا۔ مذکر۔ ایک قسم کا بڑا کھیرا۔

فرہنگ اثر — بالم کھیرا۔ ایک قسم کا سفیدی مایل چھوٹا کھیرا ہے۔ فیلن سے میری تائید ہوتی ہے۔

طاہر — حضرت اثر کے تجربے اور وسیع مطالعہ کی جس قدر عمر ہے شاید اس نامۂ سیاہ کی ساری زندگی سے زیادہ ہی ہوگی۔ اسی بنا پر یہ لکھنے کی جرأت ہوئی کہ میں نے جس قدر انگریزی لغات تھیں سب میں سپیریر کے معنی اعلیٰ۔ بڑا وغیرہ کے سوا چھوٹے کے نہیں پائے۔ فیلن صاحب نے بھی لغت میں سپیریر کا لفظ لکھا ہے سمجھ میں نہیں آیا کہ فیلن کے اس لفظ سپیریر سے حضرت اثر کی تائید کیونکر ہوئی۔ اور فیلن تو سفید عمدہ یا بڑا کھیرا کہتا ہے ہمارے لایق محقق سفیدی مایل چھوٹا کھیرا فرماتے ہیں۔ اب آیئے خالص لکھنوی شاعر بلکہ استاد کی کتاب نفس اللغہ کو دیکھئے (رشک لکھنوی فرماتے ہیں) بالم کھیرا "نوعے از نیار بود کہ نشانہائے دراز دارد و در غیر فصل پیدا شود۔

مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ
جس میں مذاہب کی ابتدا، مذہب کا فلسفہ، ارتقار مذہب کی حقیقت، مذہب کا مستقبل، مذہب سے بغاوت کے اسباب پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ قیمت ایک روپیہ ۵ پیسے
دفتر۔ نگار پاکستان۔ ۳۲ گاندھی گارڈن مارکیٹ کراچی ۳

ابوریحان محمد بن احمد خوارزمی بیرونی

(۳۶۲ — ۴۴۰ھ)

(ممتاز مرزا)

ابوریحان بیرونی بہ لحاظ علم وفضل اپنے عہد کا بڑا بے مثل انسان تھا اور خوارزم میں کوئی عالم وفاضل اس کا ہمسر نہ تھا۔ ریاضی، طبیعیات والٰہیات کا زبردست ماہر تھا۔ وہ شیخ بوعلی سینا کا ہمعصر تھا اور دُنیائے علم ودانش میں مسلم شہرت کا مالک سمجھا جاتا تھا۔

خوارزم کہاں ہے خوارزم ۳۷۸۰۰ کلومیٹر کی مسافت پر دریائے آمو کے کنارے واقع ہے اور ایران کے ہخامنشی دور حکومت کا بڑا اہم مقام سمجھا جاتا تھا، ہیروڈوٹس نے اس کا نام Charasmia لکھا ہے۔
حملۂ اعراب کے بعد دوسرے بلاد ایران کی طرح خوارزم بھی ہاتھ سے نکل گیا، لیکن چونکہ یہ مرکز خلافت سے بہت دور تھا، اس لئے ایرانی قبایل اکثر وبیشتر یہیں پناہ گزیں ہوتے تھے، یہاں تک کہ سامانیوں نے یہاں اپنی حکومت قایم کرلی اور خلفاء استیلا یہاں ختم ہوگیا۔

چنگیز وتیمور کے حملوں کے زمانہ میں خوارزم پر بڑے بڑے مصائب گزرے، لیکن صفوی عہد سے لیکر ناصرالدین شاہ کے تسلط حکومت تک یہ سلطنت ایران ہی میں شامل رہا۔ جب ۱۲۸۱ھ میں محمد امین حاکم خوارزم نے بغاوت کی تو دربار ایران نے حسن خاں کو اس کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا، اس نے محمد امین اور اس کے سرداروں کو قتل کیا اور ان کے سر کاٹ کر تہران آیا۔ یہ آخری کامیابی ایران کی تھی جس نے خوارزم پر ان کا تسلط قایم کردیا، لیکن یہ سب کچھ عارضی ثابت ہوا کیونکہ بعد کو جب انس، فرانس اور انگلستان کے درمیان خوارزم کو اپنا مستعمرہ بنانے کیلئے رقیبانہ کوششیں شروع ہوئیں تو یہاں کے خوانین روس سے ساز باز کرلی اور خوارزم پر روس کا اقتدار قایم ہوگیا۔ لیکن اس کے بعد دورۂ انقلاب میں اس کے دو حصے ہوگئے ایک حصہ جمہوریت ازبکستان میں شامل ہوگیا اور دوسرا جمہوریت ترکمنستان میں۔

ریحان کون تھا ہم پہلے بیان کرچکے ہیں کہ حملۂ اعراب کے بعد مرکز خلافت سے دور خراسان اور ماوراالنہر ایرانی امراء، شعراء، علماء کی جائے پناہ ہوگیا تھا۔ ابن سینا، رودکی، فارابی، اسماعیل بن نوح سامانی وصدہا امراء وفلسوف نے خوارزم میں پناہ لے رکھی تھی اور اپنی پچھلی روایات کو زندہ کرنے کی کوشش کررہے تھے۔ انھیں ایک ابوریحان محمد بن احمد خوارزمی بھی تھا۔

یہ شہر خیوہ میں ۳ ذی الحجہ ۳۶۲ھ میں بروز پنجشنبہ پیدا ہوا اور ۲ رجب ۴۴۰ھ میں بہ مقام غزنین وفات پائی۔

بیرونی کیوں کہتے ہیں

یاقوت حموی نے معجم البلدان میں لکھا ہے کہ اسے بیرونی اس لئے کہتے تھے کہ اس نے اپنی عمر کا بڑا حصہ تحقیق وکسب علوم کے سلسلہ میں خوارزم سے باہر بسر کیا۔ اس زمانہ میں علوم وفنون کے تین مرکز تھے۔ ایک خوارزم جہاں خوارزم شاہی حکومت قایم تھی، دوسرا گرگان جو قابوس وشمگیر ایسے دانش پرور فرمانروا کے تصرف میں تھا اور تیسرا غزنیں یا غزنہ سلطان محمود کا پایۂ تخت۔ ابوریحان نے نہ صرف ان تینوں مقامات میں تحقیق علمی کا سلسلہ جاری رکھا بلکہ ہندوستان بھی آیا اور یہاں کے علوم کا بھی اکتساب کیا۔

بیرونی کی زندگی

بیرونی نے علوم ریاضی، فلسفہ، ہیئت، تاریخ، طبیعیات والٰہیات خوارزم میں حاصل کئے اور وہ یہیں موجود تھا جب محمود غزنوی نے حسن بن بیگاں کو خوارزمشاہ کے پاس یہ پیغام لیکر بھیجا کہ بیرونی کو غزنہ بھیجدیا جائے۔ خوارزم شاہ، سلطان محمود کے حکم سے سرتابی نہ کرسکتا تھا اس لئے اس کو غزنہ بھیجدیا اور ابن سینا وغیرہ بعض حکماء اس خوف سے کہ مبادا وہ بھی طلب کرلئے جائیں، خوارزم سے ایران بھاگ گئے، لیکن کچھ ایسے بھی تھے جو ابوریحان کی طرح غزنہ آگئے۔

بیرونی بڑا غالی شیعہ تھا اور سلطان محمود سخت متعصب سنّی، لیکن یہ مذہبی اختلاف دونوں کے تعلقات میں حایل نہیں ہوا اور محمود نے اسے بڑی عزت سے رکھا، یہاں تک کہ جب اس نے ہندوستان پر حملہ کیا تو بیرونی کو بھی اپنے ساتھ لے گیا، اس نے یہاں سنسکرت پڑھی اور ہندوستان کے علوم وعقاید پر ایک بڑی مبسوط کتاب لکھی اور اتنی بے تعصبی کے ساتھ کہ اس نے بعض ہندو عقاید اور فلسفیانہ نظریوں کی بڑی تعریف کی۔

ابوریحان سات سال تک قابوس وشمگیر کی صحبت میں بھی رہا اور سارا وقت تصنیف وتالیف میں گزارا۔

شہرزوری کا بیان ہے کہ ابوریحان عربوں سے بڑا متنفر تھا اور ایران کے رسوم وعادات کا بڑا پابند تھا۔ حصول علم کے لئے اس کے شغف کا یہ عالم تھا کہ جب ابوالحسن علی بن عیسیٰ بیرونی کے مرض موت میں اس کی عیادت کے لئے گیا، تو بیرونی نے سوال کیا کہ "اے حکیم، جدات فاسدہ کی وراثت کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے"۔ ابوالحسن نے یہ دیکھ کر کہ وہ سانس بھی اچھی طرح نہ لے سکتا تھا، تعجب کیا اور کہا کہ اس سوال کا کیا موقع ہے۔ بیرونی نے کہا کہ "اگر میں کوئی بات جان لوں اور پھر مروں تو یہ اس سے بہتر ہے کہ اس کے جانے بغیر جان دیدوں۔

تالیفات وآثار بیرونی

مولف کشف الظنون اور دوسرے بہت سے مورخین نے بیرونی کی متعدد کتابوں کا حوالہ دیا ہے لیکن افسوس ہے کہ اب ان میں سے اکثر معدوم ونایاب ہیں۔ بعض کتابیں باقی رہ گئی ہیں ان کی فہرست یہ ہے:-

۱- "کتاب التفہیم لاوائل صناعۃ التنجیم"، یہ کتاب ریحانہ بانو دختر حسین خوارزمی کی خواہش پر عربی وفارسی دونوں زبانوں میں لکھی گئی تھی (۴۲۰ھ)۔ یہ تصنیف پانچ ابواب پر مشتمل تھی:- پہلا باب ہندسہ پر دوسرا باب حساب وجبر ومقابلہ پر تیسرا باب:- ہیئت، جغرافیہ واقالیم پر اور پانچواں:- احکام نجوم پر۔

۲- مکاتبات ابوریحان وابن سینا۔ جو اٹھارہ سوالات وجوابات پر مشتمل ہے، سوالات ابوریحان کے ہیں اور جوابات ابن سینا کے۔ اسی کے ساتھ بیرونی کے وہ اعتراضات بھی ہیں جو ابن سینا کے جوابات پر اس نے وارد کئے ہیں۔ اصل کتاب

عربی زبان میں ہے اور برٹش میوزیم میں محفوظ ہے، لیکن اس کا ترجمہ مرحوم ابوالفضل ساؤجی نے فارسی میں کر دیا ہے۔
الآثار الباقیہ عن القرون الخالیہ - یہ تالیف عربی زبان میں ہے اور وقایع تاریخی پر مشتمل ہے، ایک حصہ ہیئت، تاریخ اور مسلمانوں، یہودیوں، نصاریٰ اور زرتشتیوں وغیرہ کے رسوم و عقاید کے لئے بھی وقف ہے
تحقیق ماللہند۔ اس کتاب میں اس نے ہندوستان اور یہاں کے باشندوں کے حالات میں لکھی ہے — جرمن ڈاکٹر نے اس کتاب کے بابت لکھا ہے کہ اس وقت کا وہ مستشرق بھی جو سنسکرت کا ماہر ہو اس سے بہتر کتاب اس موضوع پر نہیں لکھ سکتا۔
یہ کتاب اس نے قابوس وشمگیر فرمانروائے گرگان کے نام سے منسوب کی تھی، اب فارسی میں اس کا ترجمہ ہوگیا ہے۔
قانون مسعودی (سلطان محمود غزنوی کے بیٹے مسعود کے نام سے) ہیئت میں
جواہر شناسی (سلطان مسعود کے بیٹے کے نام)
کتاب ارشاد ستارہ شناسی وعجائب طبیعی کے ذکر میں۔
سترہ کتابیں ہندوستان کے بارہ میں :-
(۱) جوامع الموجود - (۲) تہذیب زیج ارگنہ - (۳) خیال الکسوفین - (۴) تذکرہ ارقام ہندی - (۵) رسالہ راشیطات۔ علوم ہند در تعلیم حساب - (۷) ترجمہ براہیم سدھانت حساب میں - (۸) جواب در بارہ ستارہ شناسی - (۹) علماء کشمیر کے سوالوں کا جواب - (۱۰) استخراج عمر کا طریقہ ہندی - (۱۱) عربی ترجمہ کتاب موالید صغیر کا - (۱۲) ترجمہ کلب بارہ (امراض میں) تنجل کا ترجمہ - (۱۴) کتاب سامک کا ترجمہ - (۱۵) تحقیق ماللہند -
لیکن ان میں سے اکثر معدوم ہیں اور صرف ان کے نام یاد رہ گئے ہیں۔

مولانا نیاز فتحپوری کی تازہ تصانیف

شکلات غالب :- علامہ نیاز فتح پوری کی تازہ تصنیف جو چند وجوہات کی بنا پر حسب اعلان شائع نہ ہوسکی اب ماہ اکتوبر کے تیسرے ہفتہ میں شائع ہوگی - اس میں غالب کے تمام مشکل اشعار اردو کا صاف اور صحیح حل جو وضاحت بیان کے لحاظ سے حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے — قیمت دو روپیہ علاوہ محصول ڈاک

ض نغمہ :- ٹیگور کی گیتانجلی کا سب سے پہلا ترجمہ حضرت نیاز کے قلم سے جو عرصہ سے نایاب تھا چند فنی وجوہات کی بنا پر حسب اعلان شائع نہ ہوسکا اب ماہ اکتوبر کے تیسرے ہفتہ میں شائع ہوگا - قیمت ایک روپیہ پچیس پیسے علاوہ محصول ڈاک

واهش مند حضرات اور ایجنٹ اپنا آرڈر دوبارہ بک کرالیں - منیجر نگار پاکستان کراچی ۳

باب الاستفسار

(۱)

الحرب خدعۃ

(غلام محی الدین۔ اٹاوہ)

کہا جاتا ہے کہ اسلام نے جنگ کی حالت میں جھوٹ اور فریب کو جائز رکھا ہے اور اس کے ثبوت میں رسول اللہ کی حدیث "الحرب خدعۃ" کو پیش کیا جاتا ہے۔

اگر یہ صحیح ہے تو اسلام کی یہ خصوصیت کہ اس نے کسی حالت میں بھی دروغ بیانی کی اجازت نہیں دی ختم ہو جاتی ہے۔

آپ کی رائے اس مسئلہ میں کیا ہے؟

(نگار) اس میں شک نہیں، خدعۃ کے مفہوم میں مکر و فریب جھوٹ اور دغا بھی شامل ہیں اور یقیناً اس حدیث کے پیش نظر وہ شبہ وارد ہو سکتا ہے جو آپ کے ذہن میں پیدا ہوا ہے۔

اب رہا یہ امر کہ رسول اللہ نے کیوں یہ فرمایا یا یہ کہ خدعۃ کا صحیح مفہوم کیا ہے یقیناً غور طلب ہے۔ اس حدیث کے راوی عبداللہ ابن عباس ہیں اور جس محل پر آپ نے اس روایت کو بیان کیا ہے، وہ حسب روایت ابن اثیر یہ ہے کہ جب شہادت حضرت عثمان کے بعد حضرت علی خلیفہ ہوئے تو آپ نے عہد عثمانی کے عمال کو معزول کر کے دوسرے عمال ان کی جگہ مقرر کرنا چاہے۔ لیکن آپ کے بعض رفقاء نے اس کو مناسب نہیں سمجھا۔ چنانچہ سب سے پہلے مغیرہ آپ سے ملے اور کہا کہ جب تک حرمین کے علاوہ دوسرے مقامات میں بھی آپ کی بیعت پر اتفاق نہ ہو جائے۔ امیر معاویہ اور عہد عثمانی کے دوسرے عمال کو ان کی جگہ سے ہٹانا مناسب نہیں ہے لیکن حضرت علی نے اس مشورے کو قبول نہیں کیا۔

اس کے بعد عبداللہ ابن عباس نے بھی آپ کو یہی مشورہ دیا اور کہا کہ "یا امیر المومنین انت رجل شجاع لست صاحب الرائے فی الحرب، اما سمعت رسول اللہ یقول الحرب خدعۃ" یعنی آپ مرد شجاع ضرور ہیں لیکن جنگ کے باب میں صحیح الرائے نہیں، میں نے خود رسول اللہ کو یہ کہتے سنا ہے کہ

"الحرب خدعۃ"

لیکن حضرت علی پھر بھی اپنی رائے سے نہیں ہٹے اور عمال عہد عثمانی کی معزولی کو ضروری سمجھا۔

اب اس سلسلہ میں سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت علی نے عبداللہ ابن عباس کے مشورے کو کیوں رد کر دیا۔ اسکی

ب وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ آپ نے اس روایت کو صحیح نہیں سمجھا۔ دوسری یہ کہ آپ کے نزدیک یہ حدیث ان حالات پر منطبق نہیں جو اس وقت پیش نظر تھے۔

خدع کا اصل مفہوم ہے "حقیقت یا مقصود کے خلاف کسی امر کا اظہار" اور جنگ کے دوران میں اخفار حقیقت یا خدع، تدبیر مصلحت کا مفہوم اختیار کر لیتا ہے۔ اس لئے اگر اس حدیث کو صحیح مان لیا جائے تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ "لڑائی تدبیر و مصلحت چیز ہے، اور اس میں اصل مقصود کا اخفار ضروری ہے" لیکن چونکہ اس وقت کوئی جنگ درپیش نہ تھی۔ اس لئے نہ اس حدیث پیش کرنے کا موقع تھا نہ اس سے فائدہ اٹھانے کا اور ہو سکتا ہے کہ حضرت علی نے اسی بناء پر عبداللہ ابن عباس کے مشورے کو رد کر دیا ہو۔

---

(۲)

معاشقہ جعفر و عباسہ

ب سید علی اوسط۔ اجین)

بہت عرصہ ہوا جعفر و عباسہ نام کا ایک ناول میں نے پڑھا تھا جسے ہر دوئی کے کسی صاحب محمد علی نے تصنیف کیا تھا۔ ناول بڑا دلچسپ تھا، لیکن مجھے یہ معلوم کر کے بڑا تعجب ہوا کہ ہارون الرشید نے عباسہ کی شادی، جعفر سے تو کر دی لیکن تعلقات زن و شوہر قائم کرنے کی اجازت نہیں دی۔ اسی ناول سے یہ بھی پتہ چلا کہ جعفر برمکی کے زوال کا اصل سبب یہی تھا کہ اس نے عباسہ سے وہ تعلقات پیدا کر لئے جو ہارون الرشید کو پسند نہ تھے۔

اس کے بعد جب البرامکہ کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ اس واقعہ کی کوئی اصلیت نہیں ہے تو اور زیادہ تعجب ہوا کہ ایسی غلط بات کیوں مشہور ہوئی۔ کیا آپ ازراہ کرم ذریعہ نگار مطلع فرمائیں گے کہ مورخین نے اس بارہ میں کیا لکھا ہے اور اس واقعہ کی اصلیت کیا ہے؟

ب) ناول "جعفر و عباسہ" میں بھی دیکھ چکا ہوں لیکن اس عمر اور اس زمانہ میں جب اس کا خیال بھی ذہن میں نہ آتا تھا کہ اتنا تاریخی افسانہ غلط ہو سکتا ہے اور اس کے بہت دنوں بعد جب یہ معلوم ہوا کہ یہ محض داستان ہی داستان ہے جسے حقیقت سے بھی واسطہ نہیں، تو بڑا دکھ ہوا اور سارا مزہ کرکرا ہو گیا۔

عباسہ، خلیفہ مہدی عباسی کی بیٹی اور ہارون الرشید کی بہن تھی۔ یہ اپنے فضل و کمال حسن تربیت اور پاکیزگی ذوق کے لحاظ سے عہد کی خواتین میں بڑا ممتاز درجہ رکھتی تھی اور نہ صرف ادب و موسیقی بلکہ علم مجلس اور ذاتی اخلاق کی بلندی کے اعتبار سے بھی ل اور بے نظیر سمجھی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہارون الرشید اس سے بڑی محبت رکھتا تھا اور اس کی کوئی مجلس علم و ادب عباسہ سے تہ ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ یہ بھی صحیح ہے کہ رشید، جعفر سے بھی بہت مانوس تھا اور اس کے تمام مشاغل تفریح میں جعفر کی شرکت بھی ی تھی۔ اس لئے یہ تو ماننا پڑے گا کہ رشید کی محافل طرب میں ان دونوں کی معیت ناگزیر سی بات تھی لیکن یہ خیال کرنا کہ جعفر و عباسہ یا ہونے کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ ان دونوں کو رشتۂ ازدواج سے وابستہ کر دیا جائے، درست نہیں کیونکہ اس وقت تک حجاب

یا پردہ کی پابندی اتنی شدید نہ تھی کہ عورت و مرد کا اجتماع کسی جگہ معیوب سمجھا جائے۔

جعفر و عباسہ کی روایت معاشقہ سب سے پہلے طبری نے بیان کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "ہارون الرشید ان دونوں سے اس درجہ مانوس تھا کہ بغیر ان کی شرکت کے اس کی کوئی مجلس کامیاب نہیں ہوتی تھی اس لئے ان دونوں کے اجتماع کو جائز قرار دینے کے لئے اس نے شرعی رشتۂ ازدواج بھی قائم کر دیا جو محض ایک رسمی سی بات تھی اور تعلقات زن و شو سے اسے کوئی واسطہ نہ تھا، لیکن بعد کو اس شرعی بہانے نے حقیقت کی صورت اختیار کر لی اور چھپ چھپ کر دونوں ایک دوسرے سے خلوت میں بھی ملنے لگے۔ یہاں تک کہ ان سے اولاد بھی ہوئی اور جس وقت ہارون الرشید کو اس کا علم ہوا تو اس نے جعفر کو قتل کرا دیا۔

طبری کی اس روایت کو تسلیم نہ کرنے متعدد اسباب ہیں ایک تو یہ کہ خود اس نے پورے وثوق کے ساتھ یہ واقعہ بیان نہیں کیا، بلکہ صرف یہ کہا ہے کہ "قتل جعفر اور زوال برامکہ کا ایک سبب یہ بھی بتایا جاتا ہے۔ لیکن یہ بتانے والا کون تھا؟ ہم سمجھتے ہیں طبری کا یہ کہنا بھی صحیح نہیں کیونکہ اس سے قبل کسی مورخ نے اس کا کہیں ذکر نہیں کیا اور اگر یہ خیال درست ہے کہ وہ مایل بہ تشیع تھا تو ہو سکتا ہے کہ یہ روایت اس نے محض عباسی خاندان کو بدنام کرنے کے لئے گھڑ لی ہو۔ اس میں شک نہیں کہ طبری کے بعد کے مورخین نے بھی اس واقعہ کا ذکر کیا ہے، لیکن ان سب کا ماخذ طبری ہی کا بیان ہے یہاں تک کہ ابن خلدون نے بھی اس کو مشکوک قرار دینے کے باوجود پوری طرح اس کی تردید نہیں کی۔

اب دوسرے زاویۂ نظر سے غور کیجئے جو خود طبری ہی کی روایت کے مطابق ہمارے سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ جب جعفر و عباسہ کا یہ معاشقہ ہوا تو اس وقت عباسہ کی عمر چالیس سال کی تھی اور اس سے قبل اس کے دو شوہر کے انتقال کو بھی گیارہ سال ہو چکے تھے۔ چنانچہ اس خیال کے پیش نظر کہ عباسہ اپنے شوہروں کے حق میں بہت منحوس واقع ہوئی ہے۔ ابونواس (دربار رشید کے مشہور شاعر) نے اپنے ایک قطعہ میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ "خلیفہ اگر اپنے کسی باغی امیر سے ناخوش ہو تو اسے قتل کیوں کرائے۔ عباسہ سے شادی کر دینا کافی ہے۔"

الغرض جعفر و عباسہ کی محبت کا زمانہ وہ تھا جب عباسہ ادھیڑ ہو چکی تھی اور اس کے دو شوہر پہلے مر چکے تھے۔ اس لئے یہ بھی نہیں سمجھا جا سکتا کہ جوش جوانی سے مجبور ہو کر اس نے جعفر سے اختلاط پیدا کیا ہو گا۔ دوسری لطف کی بات یہ ہے کہ محض مورخین نے بالکل اسی قسم کا واقعہ ہارون الرشید کی دو اور فرضی بہنوں میمونہ اور فاختہ کے متعلق بھی بیان کیا ہے۔

عربوں کے عہد جاہلیت میں بے شک ایک روایت اس قسم کی پائی جاتی ہے کہ کسی بادشاہ نے اپنی بہن کی شادی اپنے وزیر سے کر دی تھی جس کا انجام برا ہوا اور ہو سکتا ہے کہ بعد کو لوگوں نے یہی روایت جعفر و عباسہ پر چسپاں کر دی ہو۔

طبری اور دوسرے قدیم مورخوں نے اس روایت کے سلسلے میں عباسہ کا کوئی ذکر نہیں کیا لیکن بعد کے مورخوں نے تو عباسہ کا انجام بھی بہت برا دکھایا ہے اور انھیں مورخوں کو سامنے رکھ کر نہ صرف مغربی مصنفین بلکہ خود عربی مصنفین نے بھی بات کا بتنگڑ ا بنا دیا۔

نظیر نمبر جس میں نظیر اکبرآبادی کی قدرت زبان و بیان، اس کا معیار تغزل۔ ادبیات اردو میں اس کا فنی اور لسانی درجہ، اس کا شاعری میں مقام۔ معاصرین کی رائیں، مستند ادبا کی موافقت و مخالفت میں تنقیدیں اور اس کی خصوصیات انداز شاعری پر سیر حاصل تبصرہ ہے۔

قیمت:۔ تین روپے

دفتر:۔ نگار پاکستان۔ ۳۲ گاندھی گارڈن مارکیٹ کراچی ۳

(۳)

Persepholis کس شہر کا نام ہے

(سید جمیل الدین خاں۔ بنگلور)

انگریزی کتابوں میں بہ سلسلۂ تاریخ ایک مقام "Persepholis" کا ذکر بھی ملتا ہے۔ لیکن یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس سے کونسا مقام مراد ہے اور تاریخ ایران میں کیوں اس کو اتنی اہمیت حاصل ہے۔ دوسری بات یہ دریافت طلب ہے کہ بغداد کا نام "دارالسلام" کس زمانہ میں رکھا گیا۔

(نگار) آپ نے جس مقام کا نام انگریزی میں لکھا ہے، وہ وہی ہے جسے مشرقی مورخین اصطخر کہتے ہیں۔ یہ فارسی کے ایک شہر کا نام ہے جسے سکندر نے تباہ کر دیا تھا اور اب اسی کے کھنڈر پر نئی آبادی بس گئی ہے۔

اس کی تاریخی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایران میں ساسانیوں کا مرکز یہی مقام تھا اور ساسان اردشیر اول کا دادا یہیں کے آتشکدہ کا متولی تھا۔ یہ وہی آتشکدہ ہے جس کی بابت کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ کی یوم ولادت میں از خود ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ تخت جمشید اور نقش رستم بھی یہیں پائے جاتے تھے۔

مسلمانوں کا تعلق اس شہر سے ۶۴۸ء میں ہوا ہے جب گورنر بصرہ عبداللہ بن عامر نے اسے فتح کیا۔

بغداد جس کا تلفظ اہل ایران بُغداد کرتے ہیں اور جس کے معنی عطیۂ خداوندی کے ہیں بڑا قدیم شہر ہے جو عہد وسطیٰ میں بغدان کے نام سے موسوم تھا۔ عہد عباسی میں جب خلیفہ منصور نے اسے ۱۴۶ھ میں دوبارہ آباد کیا تو اس کا نام دارالسلام رکھا، لیکن یہ نام زیادہ مقبول نہ ہوا اور بغداد بدستور قائم رہا۔

---

(۴)

کیا دیوان مخفی زیب النسا کا ہے

(جناب محمد طفیل۔ گورگاؤں)

میرے پاس ایک قلمی نسخہ فارسی دیوان کا ہے جس کے سرورق پر دیوان مخفی لکھا ہوا ہے، جو غالباً زیب النسا کا تخلص تھا۔ لیکن میں نے یہ بھی سنا ہے کہ زیب النسا نے اپنے بعد کوئی دیوان نہیں چھوڑا اور مخفی کسی اور شاعر کا تخلص ہے آپ کی رائے اس باب میں کیا ہے۔

(نگار) دیوان مخفی کا قلمی نسخہ جس کا آپ نے ذکر کیا ہے، میرے سامنے نہیں اس لئے میں اس کی بابت کیا کہہ سکتا ہوں کہ وہ کس کا ہو سکتا ہے آپ اپنا دیوان کھول کر دیکھئے کہ اس کا پہلا شعر کیا ہے۔ اگر وہ شعر یہ ہے:-

اے ز ابر رحمتت خرم گل بستان ما گفتگوے حرف عشقت مطلع دیوان ما

رنگِ تغزل

نیّر اکبر آبادی

شباب تھا مگر اندازۂ شباب نہ تھا!
اِدھر نگاہ نہ تھی اسطرف حجاب نہ تھا!

بڑھی ہے قلب کی دھڑکن تمہارے وعدوں سے
امیدوار کو پہلے یہ اضطراب نہ تھا!

وہ ایک تم تھے کہ پھولوں پہ بھی نہ آئی نیند
وہ ایک میں مجھے کانٹوں پر اضطراب نہ تھا!

آنکھوں میں آکے دِل کا لہو ہے رکا ہوا!
رو لے کوئی غریب اگر تم خفا نہ ہو!

تیشہ پہ اعتبار تھا تجھ کو تو کوہکن
وہ کیا کرے کہ جسکا کوئی آسرا نہ ہو!

شاعر لکھنؤی

خدا کرے کہ پھر ان تک کبھی نہ جام آئے
جو میکدے میں گئے اور تشنہ کام آئے

کچھ اور عشق کے اسرار کھول دیتی ہے
یہ احتیاط کہ لب پر نہ ان کا نام آئے

روا نہیں ہے مسلسل سکوتِ میخانہ
کبھی کبھی تو صدائے شکستِ جام آئے

شفقتؔ کاظمی

متاعِ شوق ہے سرمایۂ تمنا ہے
وہ ایک زخم جو تیری نظر نے بخشا ہے

کسی اسیر کی میعاد کٹ گئی شاید
نجانے کیوں درِ زنداں پہ شور برپا ہے

گماں ہوا کہ مقدر بدل گیا اپنا!
کچھ اس ادا سے مری سمت اسنے دیکھا ہے

ترے خیال کی دلچسپیاں نہیں بھولیں
اگرچہ تجھ کو بھلائے زمانہ گذرا ہے

یقین جان کہ پھر لوٹ کر نہ آئے گا!
وہ بے نوا کہ تری رہگذر سے اٹھا ہے

ہوائے رسم و رہِ عاشقی بجا شفقتؔ
مآلِ رسم و رہِ عاشقی بھی سوچا ہے!

ان کو مکتوب جو لکھنے بیٹھے — کتنے عنوان ہمیں یاد آئے
کیا خبر آج وہ کس حال میں ہیں — عمر گذری ہے جنہیں یاد آئے

ارشد صدیقی

سکون مانگا ہے گھبرا کے شورشِ غم سے — یہ لغزشیں بھی ہوئی ہیں کبھی کبھی ہم سے
تباہیاں میری قسمت سہی مگر اے دوست — شکایتیں ہیں ترے التفات پیہم سے
اٹھا ہوں لیکے اسی بزم سے بنام خلوص — نقوشِ رسم و وفا اور وہ بھی مبہم سے
کبھی ہمیں پہ بہاروں کو ناز تھا ارشد — نظر چراتے ہیں آج اہلِ گلستاں ہم سے

سعادت نظیر

جو عمر وقفِ غمِ روزگار گذری تھی — نجانے کیوں وہ بڑی خوشگوار گذری تھی
فریبِ نورِ سحر دے گئی عنادل کو — جو سیلِ برق سرِ شاخسار گذری تھی
خبر ہے کسکو نشیمن کے چار تنکوں کی؟ — یہ جانتا ہوں صبا بیقرار گذری تھی
زمانہ جس کو قیامت سمجھ رہا ہے اب — ہمارے سر سے وہی بار بار گذری تھی

شارق میرٹھی

ہنس دئے سنکے فسانہ دل کا — اور وہ اس کے سوا کیا کرتے
رو دئے تھام کے دامن ان کا — اور برباد وفا کیا کرتے
دیکھتے رہ گئے ان کو شارق — سجدۂ شکر ادا کیا کرتے

عمر بھر دور رہے وہ ہم سے — ہم جنہیں دل سے جدا کر نہ سکے
لب پہ آیا تھا فقط ذکرِ وفا — ہم کوئی اور خطا کر نہ سکے

نذیر بنارسی

کیا اب آنکھوں کی قسمت میں دامن نہیں — کتنے آنسو یونہی رائگاں ہو گئے!
تم ہنسو ہم کو ہنسنے کی فرصت نہیں — کیا یہ کم ہے تم شادماں ہو گئے!
ہر گھڑی چپ بھی رہنا بھلا تو نہیں — جانے کتنے یونہی بے زباں ہو گئے!

ہونے والا تھا کوئی بڑا حادثہ — وہ تو کہئے کہ آنسو رواں ہو گئے
بزم میں کوئی تو ساتھ دیتا مرا! — سب تمہارے ہی کیوں ہم زباں ہو گئے

ممتاز مرزا

لوگ کہتے ہیں کہ آج آپ نے کوسا مجھ کو
وائے گر اب بھی ہو جینے کی تمنا مجھ کو
وسوسے دل میں گذرتے ہیں نجانے کیا کیا
آپ جایا نہ کریں چھوڑ کے تنہا مجھ کو
آپ کو دیکھ کے ممکن تھا سنبھل جاتا میں
آپ نے بھی تو مگر لوٹ کے دیکھا مجھ کو
دیر بھی سیر کے قابل ہے حرم بھی لیکن
دیکھوں لے جائے کدھر ذوقِ تماشا مجھ کو
جان پر بن گئی اس کشمکشِ پیہم سے
ضبط کی تاب نہ اظہار کا یارا مجھ کو
تھک گئے پاؤں مرے راہِ طلب میں ممتاز
ورنہ ہر گام پہ منزل نے پکارا مجھ کو!

"نگار" پاکستان کا آئندہ سالنامہ

استفسارات نمبر ہوگا

علمی، ادبی و تاریخی معلومات کا بے بہا خزینہ

حضرت نیاز فتح پوری کے قلم سے (مینجر)

شمشاد نجمہ

جناب عزیز جاوید مدیر آدگس لاہور نے اگست ستمبر کے تازہ شمارہ میں شمشاد نجمہ کے کلام پہ جن الفاظ میں اظہار خیال کیا ہے ان سے قطع نظر ہم صرف وہ اشعار یہاں پیش کرتے ہیں جو تبصرہ و تعارف سے بے نیاز ہیں۔ (نیاز)

دلوں سے جہاں سے زمان و مکاں سے — میں رسمِ وفا ہوں اٹھی جا رہی ہوں!
ترے عشق کی بن گئی ہوں کہانی — کہی جا رہی ہوں سُنی جا رہی ہوں!
محبت کی میں شامِ فرقت ہوں نجمہ — مصیبت سے کٹتی چلی جا رہی ہوں!

بہکی ہوں میں لطیف جوانی کے کیف سے — ہر چیز کو شراب کئے جا رہی ہوں میں

زمانے میں مجھ کو نہ بدنام کر دے — مرے حال پر یہ تری مہربانی!

تم نہ سمجھے تو کون! سمجھے گا؟ — میری راز و نیاز کی باتیں!
جب مرے پاس وہ نہیں ہوتے! — ان سے ہوتی ہیں راز کی باتیں!

ان کی نظر میں دیکھ لیا اپنے آپ کو — مجھ کو مرا ہی جلوہ دکھا کر چلے گئے!
جس راہگذارِ شوق سے ان کا گذر ہوا — اک شمع آرزو کی جلا کر چلے گئے!

شعور و ذہن میں اک روشنی محسوس کرتی ہوں — مری ہستی میں آخر کون شامل ہوتا جاتا ہے

تصوّرات کی دنیا ہے اک فریبِ نظر! — وہ آگیا وہ رکا وہ چلا گیا کوئی!

بھڑک کر شعلہ بن جائے کہ بجھ کر راکھ ہو جائے
ہوا کی زد پہ شمع زندگانی لے کے آئی ہوں

نظام کون و مکاں جن میں محو گردش ہے
وہ اشکبار نگاہیں سلام کہتی ہیں!

اتنا بلند ذوق نہیں اہل عشق کا
یہ کیا سمجھ کے حسن نے آنسو بہا دیئے

یاس کے پردوں میں پھر امید نے لیں کروٹیں
پھر فریب زندگی کھانے کا موسم آگیا

یہ تڑپ یہ درد یہ رگ رگ میں ہلکی سی کسک
یہ شباب آیا کہ مر جانے کا موسم آگیا

مدت سے گرچہ دیکھ رہی ہوں خود اپنی راہ
تیرا بھی انتظار کئے جا رہی ہوں میں!

خیر گذری بدل گئی دنیا
قہر ہوتا جو تم بدل جاتے!

چھیڑی جو میں نے تیری جوانی کی داستاں
تارے، شراب، پھول، سبو مسکرا دیئے

یہ کھلتا نہیں کچھ وہ تم تھے کہ میں تھی!
مگر یہ کہ حائل کوئی درمیاں تھا!

کیا جانے کس سے کہتی ہوں خوابوں کے سنہرے افسانے
ٹھہرو کہ ابھی میں آتی ہوں ٹھہرو کہ بن آئے آتی ہوں

پھر بجھ سندر سپنوں میں بننے لگے قصر امیدوں کے
پھر ریت کے گرتے ساحل پہ بنیاد اٹھائے جاتی ہوں

مسکرانا تو بڑی شے ہے یہاں!
اب تو رونے سے بھی جی بیزار ہے!

زیست کے احساس کو کھوئے بھی مدت ہو گئی
مسکرانا کیا کہ اب رونے بھی مدت ہو گئی!

یہ دنیا یہ خلوص و عشق کے رنگ آفریں نغمے!
بیاباں میں گلستاں کی کہانی لے کے آئی ہوں

طور و کعبہ سے ہم پھرے مایوس!
اور کچھ دور تک نکل جاتے!!

گھر — خوشیوں کا گہوارہ

تاریخِ قدیم سے آج تک انسان نے سکون و راحت کے لئے محفوظ و پختہ مکانات تعمیر کئے ہیں۔

جوں جوں زمانہ بیتا، انسان بتدریج غار، جھونپڑے، خیمے، کچی مٹی کے مکانات اور پتھروں کی تعمیرات کے لئے بہتر سے بہتر وسائل استعمال کرتا رہا تا آنکہ دورِ حاضرہ میں پختہ، خوبصورت اور پُرعظمت تعمیرات کے لئے سیمنٹ کا استعمال شروع ہوا۔

ویسٹ پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن کا تیار کردہ ذیل پاک اور میپل لیف سیمنٹ پاکستان کو خوشیوں کا گہوارہ بنانے میں پیش پیش ہے۔ اور بین الاقوامی معیار کے مطابق بہترین شمار کئے جانے والے اس سیمنٹ سے تعمیر شدہ عمارات پختگی میں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔

ہر جگہ آسانی سے مل سکتا ہے۔

ZEALPAK

MAPLE LEAF

ویسٹ پاکستان

صنعتی ترقیاتی کارپوریشن

NATIONAL 384 3

مطبوعات موصولہ

شب چراغ مجموعہ ہے جناب خاور نوری کی غزلوں کا جسے مغل اکاڈیمی حیدرآباد دکن نے حال ہی میں خاصے سلیقہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔ جناب خاور نئے شاعر نہیں ہیں۔ ان کا کلام مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ جناب نجم آفندی کے شاگرد ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں اپنے استاد کی طرح بہت سوچ سمجھ کر کہتے ہیں۔

ترقی پسندی اگر کوئی ایسی اصطلاح نہیں جس کا تعلق یکسر غیر ذمہ دارانہ شاعری سے ہو، تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ جناب خاور انھیں شعراء میں سے ہیں جنھوں نے غزل گوئی میں کافی ترقی پسندی سے کام لیا جسے دوسرے الفاظ میں اسلوب بیان کی جدت کہا جاسکتا ہے۔

جناب خاور کی شاعری گل و بلبل یا شمع و پروانے کی داستان پارینہ نہیں۔ بلکہ اس نفسیاتی احساس کی تخلیق ہے۔ جس کی قوت و وسعت کی بے پایانی کا اندازہ دشوار ہے۔

ہر چند جناب خاور نے ان شاعرانہ علائم و اشارات سے بھی کام لیا ہے جسے کلاسکل شاعری کی بنیاد کہنا چاہئے۔ لیکن اس کے صرف میں انھوں نے کافی جدت سے کام لیا ہے اور غالباً یہی وہ چیز ہے جسے "نئی غزل" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

عام طور سے غزل کو بڑی فرسودہ صنف سخن سمجھا جاتا ہے حالانکہ غزل ہی وہ صنف سخن ہے جو کبھی فرسودہ نہیں ہوسکتی اور ہر شاعر کے احساس کے ساتھ اسکی جداگانہ تخلیق ہوتی ہے۔ ہاں اگر کوئی شاعر خود ہی اپنی فکر و احساس کے لحاظ سے "مقلد فرسودگی" ہو تو یہ اس کی کم مائگی ہے۔ غزل کی تنگ دامانی نہیں۔ ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ خاور کا کلام اس نقص سے بڑی حد تک پاک ہے اور محض تقلید ان کا شعار نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ جذبات اپنی نوعیت کے لحاظ سے زیادہ متنوع نہیں، لیکن اسلوب اظہار کے اعتبار سے وہ بہت وسیع ہیں اور جناب خاور کے ہاں اس کی مثالیں بکثرت مل جاتی ہیں۔ مثلاً:

میں گر رہا ہوں سنبھال اے شعور خود داری — وہ یہ سمجھتے ہیں میں ان کا نام لے لوں گا

خود مجھے موت کی تعظیم کو جانا ہی پڑا — موت کو میرے قریب آنے کی ہمت نہ ہوئی

اہل دل اشک فشانی نہیں کرتے خاور — غم کا احساس بہ انداز دگر کرتے ہیں

شمع نے پائی نہ پروانے کی روح — دور تک شعلے لپک کر رہ گئے

ہم تمھاری منزل تک سب کو چھوڑتے آئے — آخری سلاموں کا اک ہجوم لے آئے

اپنا ہو غیر کا ہو، گریباں کسی کا ہو — دستِ جنوں کو صرف گریباں سے کام ہے

خودداری حیات کو کیا منہ دکھاؤں گا — کیا رنگ اڑ گیا ہے مرا التجا کے بعد

بگڑ گیا مجھے مسجد میں دیکھ کر واعظ — خدا کے گھر میں بھی انسان کو پناہ نہیں

اُدھر ہیں اہلِ نشیمن، اِدھر ہیں اہلِ قفس — بہار آتی ہے کس راستہ سے کیا معلوم

کھلتا ہے پھول ایک تبسم کے واسطے — کتنا سرور زندگی مختصر میں ہے

ستم ہے لوٹ لیا ان کو راہزن کہہ کر — تمھاری راہ سے ہٹ کر جو اپنی راہ چلے

غم ساتھ ہو تو میری طرح سب یہی کہیں — کتنی طویل زندگی مستعار ہے

یہ کوئی میری تباہی کی تلافی تو نہیں — میں نے مانا کہ وہ کچھ دیر پشیماں ہوں گے

کسے بتاؤں محبت کے کھیل کا انجام — میں ان کو جیت کے بازی انھیں سے ہار آیا

راہ بلند و پست ہے، رات ہے اور اندھیری رات — اور قریب آئیے ہاتھ سے چھٹ نہ جائے ہاتھ

اس اقتباس سے جو بہت کم ہے اندازہ ہو سکتا ہے کہ خادر کیسا درخشاں غزلگو ہے اور اس کی انفرادیت کا راز صرف اس کے اندازِ بیان اور اسلوبِ اظہار میں مضمر ہے۔

یہ مجموعہ ڈیڑھ روپیہ میں مغل اکاڈیمی حیدرآباد دکن سے مِل سکتا ہے۔ (ن - ف)

تدریسِ اُردو

پروفیسر فرمان فتحپوری کی تصنیف ہے، جسے حال ہی میں مکتبۂ جامعہ تعلیم ملی کراچی نے شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں فاضل مصنف نے اُردو زبان کی پیدائش کا مختصر سا جائزہ لینے کے بعد اس کی اہمیت کی وضاحت کی ہے اور پھر اس کے اصول درس و تدریس پر معلمانہ نقطۂ نظر سے گفتگو کی ہے جو اس تصنیف کا حقیقی مقصود ہے۔ اس وقت جبکہ اُردو زبان کی تعلیم مکتبوں سے ہٹ کر مدرسوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کی بلند و منظم درسگاہوں تک پہنچ گئی ہے۔ اس کی پیچیدگیاں بہت بڑھ گئی ہیں جن کا تعلق زیادہ تر تعین نصاب اور امتحانات سے ہے۔ اب سے پچاس سال پہلے اُردو کا کوئی الگ نصاب مقرر نہیں تھا۔ عموماً پہلے فارسی و عربی پڑھائی جاتی تھی اور اسی کے ساتھ اُردو، مادری یا قومی زبان ہونے کی حیثیت سے بغیر کسی مخصوص و متعین نصاب کے از خود آجاتی تھی۔ لیکن اب کہ فارسی و عربی تعلیم (جس پر اُردو کی بنیاد قائم تھی) ختم ہو چکی ہے، یہ سوال اپنی جگہ یقیناً بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ کہ اگر بغیر کسی بنیاد کے تعمیرِ اُردو قائم کی جا سکتی ہے، تو اس کا ڈھانچہ کیا ہونا چاہیئے جو باوجود نا استواری کے بھی استوار نظر آئے۔ اور اسی چیز کو آجکل تدریس یا Training کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ میرا یہ کہنا الزام کی حیثیت نہیں رکھتا۔ کیونکہ زمانہ اتنی ترقی کرتا جا رہا ہے کہ اس کا ساتھ دینے کیلئے ہم کو اپنی بہت سی روایات ترک کرنا ضروری ہو گیا ہے اور اس "عہدِ ضرورت" کے عہد میں "عہدِ فراغت" کی یاد کوئی معنی نہیں رکھتی۔

جناب فرمان کراچی یونیورسٹی میں اُردو کے استاد ہیں اور ان کو معلوم نہیں اس سلسلہ میں کن کن دشواریوں سے واسطہ پڑتا ہوگا، لیکن انھوں نے اس کتاب میں صرف انھیں باتوں کو سامنے رکھا ہے جنھیں درس و تدریس کی بنا کہا جا سکتا ہے۔

انھوں نے اس کتاب میں اُردو تدریس کے مقاصد و ذرایع، پر گفتگو کرتے ہوئے نہایت تفصیل کے ساتھ ان عملی وسائل پر بھی روشنی ڈالی ہے جو اُردو کی تعلیم کو آسان بنانے کے لئے ضروری ہیں۔

یہ کتاب نتیجہ ہے جناب فرمان کے ان تجربات کا جو انھیں اپنی معلمانہ زندگی میں حاصل ہوئے اور اس لئے اس کی

افادیت سے انکار ممکن نہیں۔

کتاب کی زبان حد درجہ صاف و شگفتہ ہے اور اسلوب بیان نہایت سہل۔ یہ کتاب ٹائپ کے حروف میں خاص اہتمام سے نفیس کاغذ پر چھاپی گئی ہے۔

(ن۔ ف)

مثنوی زہر عشق اور اس کے نقاد

تیس سال پہلے جناب مجنوں گورکھپوری نے مثنوی زہر عشق شائع کی تھی، جس میں ان کے بسیط مقدمہ کے علاوہ عبدالماجد دریابادی، احسن لکھنوی اور نیاز فتحپوری کی بھی ناقدانہ رائیں بھی شامل تھیں۔ الغرض یہ ایک ادبی ہیجان تھا مجنوں گورکھپوری کا جسے دنیا عرصہ ہوا فراموش کر چکی تھی۔ لیکن اب جناب محمد حسن صاحب نے یہ کتاب لکھ کر اس کی یاد پھر تازہ کر دی ہے۔

یہ کتاب جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے "نقد النقد" کی حیثیت رکھتی ہے جس میں جناب مجنوں اور عبدالماجد کی رایوں سے اختلاف کیا گیا ہے۔ اور مجھے اس اختلاف سے اتفاق ہے۔

جناب محمد حسن کی یہ کتاب صرف "نقد النقد" نہیں بلکہ بجائے خود بڑا پاکیزہ انتقادی کارنامہ بھی ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد حسن صاحب نقد و انتقاد کا ایک خاص انفرادی ذوق رکھتے ہیں اور ہمیں امید ہے کہ وہ ہمیں آئندہ بھی اپنی اس اہلیت سے مستفید ہونے کا موقع دیتے رہیں گے۔

کتاب نہایت اہتمام سے ٹائپ کے حروف میں مجلد شائع کی گئی ہے اور پانچ روپے بارہ آنے میں ادارۂ مطبوعات الحسن سے (۱۸ مسجد بازار بہار کالونی کراچی کے پتہ پر) مل سکتی ہے۔

(ن۔ ف)

SOME ASPECTS OF THE CONSTITUTION AND THE ECONOMICS OF ISLAM.

زیر تبصرہ کتاب جناب نصیر احمد شیخ۔ ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی کی تصنیف ہے جو دوکنگ مشن لٹریری ٹرسٹ لندن سے شائع ہوئی ہے۔ قیمت مجلد ساڑھے تیرہ شلنگ غیر مجلد ساڑھے بارہ شلنگ ہے۔ ہمارے مطالعہ میں کتاب کا تیسرا اڈیشن ہے جو ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا ہے۔ کتاب میں پاکستان کے سابقہ دستور اور معاشیات وغیرہ پر اسلامی نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے مصنف نے اپنے موقف کو قرآن اور سنت سے مدلل کرنے کی کوشش بلیغ کی ہے۔ نتیجۃً کتاب قابل مطالعہ اور فکر انگیز ہے، مزید برآں پاکستان کے پیش آمدہ معاشرتی اور خصوصاً معاشی مسائل پر وافر مواد پیش کیا گیا ہے۔ ان مسائل کے سلسلے میں مصنف کے موقف سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور بعض مقامات پر ان کا موقف دلائل اور استخراج نتائج میں نا تسلی بخش بھی سمجھا جا سکتا ہے تاہم ہمارے خیال میں ان اہم مسائل پر جو پاکستان کے ناگزیر قیام کے بعد عملاً اور فوری طور سے حل طلب ہیں۔ اس انداز سے بحث اور تمحیص کی بہر حال ہمت افزائی کی جانی چاہیے۔ ہمیں خوشی ہے کہ پاکستان میں بہت سے حضرات ان مسائل پر جو آج عمومیت سے دنیائے اسلام کو درپیش ہیں (بلکہ ایک معنی میں خود مغربی ممالک کو بھی جن کی خوشہ چینی اول الذکر ممالک اب تک کر رہے ہیں، حالانکہ خود مغربی ممالک "کہنگی زتماشا برانگنم" پر عمل شروع کر چکے ہیں)۔ غور و فکر سے کام شروع کر چکے ہیں۔ پھر بھی یہ تو ہو سکتا ہے کہ آج کی یہ کوششیں کمزور ہوں لیکن یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ کل یہ کمزوریاں دور کر دی جائیں گی،

بیت المال اور نظام زکوٰۃ کا قیام بلاشبہ ہر مسلم ملک کی اور پاکستان کی اہم ترین ضرورت ہے۔ مثلاً ہمارے ائمہ و فقہا نے "مالِ نامی" کی اصطلاح استعمال کی ہے جس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ آج کے حالات میں مکان۔ دکان۔ مشینری۔ فیکٹری کی صورت میں جائداد و دولت "مال نامی" کی اصطلاح میں داخل ہوگی یا نہیں۔ آج کے فقہا اور اہل فکر کا فریضہ ہے کہ ان مسائل پر

غور کریں اور کوئی قابلِ عمل حل پیش کریں۔ نصیر احمد شیخ صاحب بھی اسی انداز پر اپنے نتائج فکر پیش فرماتے تو کتاب کی افادیت بڑھ جاتی۔

اس کے علاوہ بعض اور امور میں بھی افسوس ہے کہ کتاب جامع نہ بن سکی۔ شاید مصنف نے اپنے متفرق مضامین کو جو اخبارات و رسائل میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے ہیں ایک مستقل تصنیف کی شکل دینے میں اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے تکلف محسوس کیا۔ انگریزی زبان کے استعمال میں بھی کئی جگہ ذوقِ سلیم گرانی محسوس کرے گا۔ ہمیں امید ہے کہ مصنف آئندہ اشاعت میں ان خامیوں کو دور فرمائیں گے۔

کتاب کے شروع میں مصنف نے ان حضرات کی ایک فہرست بھی دی ہے جن سے وہ کسی نہ کسی حیثیت سے متاثر ہوئے ہیں۔ ان میں سے بعض ہستیاں مسلمانوں کے ثقہ حلقوں میں مشتبہ یا غیر معروف سمجھی جائیں گی۔ یوں بھی ہم بدقسمتی سے مخاصمانہ نہیں تو محاذلانہ یا جانبدارانہ ذہنوں کے مظاہرے کرتے رہتے ہیں۔ اس لئے اچھا ہوتا اگر یہ نام پیش لفظانہ انداز میں نہ دئے جاتے۔

(م۔ ا)

مندرجہ ذیل کتابوں کی

چند کاپیاں رہ گئی ہیں خواہشمند حضرات فوراً طلب کریں

من ویزداں (کامل)، من ویزداں حصہ دوئم (مذہبی استفسارات و جواب) ترغیبات جنسی (نایاب)
سات روپے پچاس پیسے ——— پانچ روپے پچاس پیسے ——— بیس روپے

نگارستان ——— جمالستان ——— عرض نغمہ ——— مشکلات غالب ——— شہاب کی سرگذشت
چار روپے پانچ روپے پچاس پیسے ایک روپیہ پچیس پیسے دو روپے پچاس پیسے دو روپے

مکتوبات نیاز (تین حصے) بارہ روپے فراست الید قیمت ایک روپیہ

علاوہ محصول ڈاک

منیجر نگار پاکستان ۳۲ گاندھی گارڈن کراچی ۳

تبصرہ کے لئے کتابیں کراچی کے پتہ پر ارسال کریں۔ منیجر

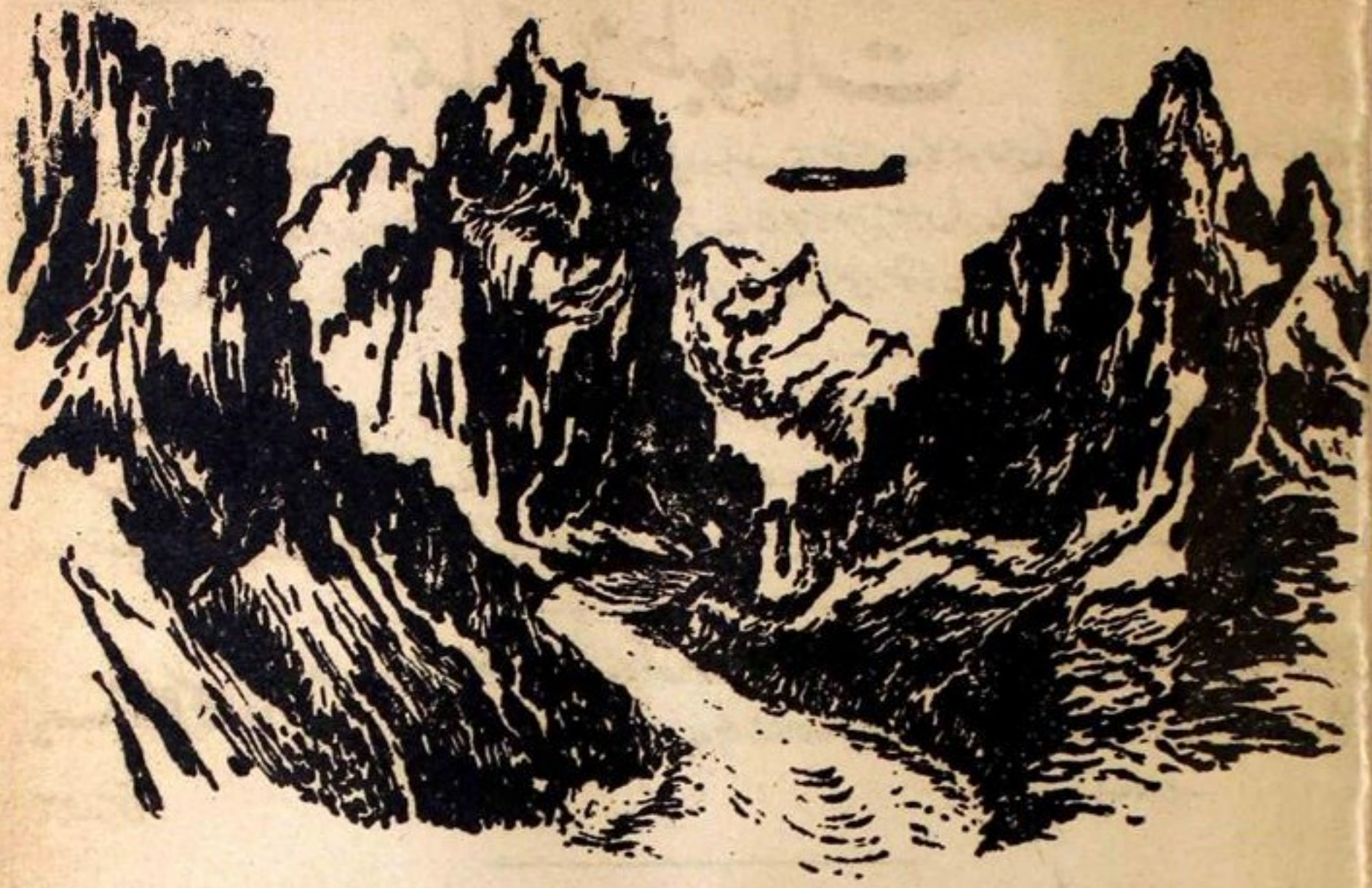

گلگت ۔ جہاں تیل پہونچانے کے لئے خطرناک پرواز سے دوچار ہونا پڑتا ہے

برماشیل کی لاریاں آپ نے اکثر دیکھی ہوں گی۔ یہ لاریاں برماشیل کی تقسیم کاری کا ایک اہم جز ہیں اور سیال ایندھن اور مزیقات کو گاؤں گاؤں اور شہر شہر بانٹتی پھرتی ہیں۔
لیکن پاکستان کے بعض پہاڑی علاقے ایسے بھی ہیں جو ان لاریوں کی رسائی سے باہر ہیں۔
مثلاً گلگت۔ چنانچہ گلگت کے علاقہ میں جو تیل یا تیل کی مصنوعات استعمال ہوتی ہیں انھیں برماشیل پی آئی اے کے ڈکوٹا طیاروں کے ذریعہ بھیجتی ہے۔ غرض ملک کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں برماشیل تیل نہ پہونچاتی ہو

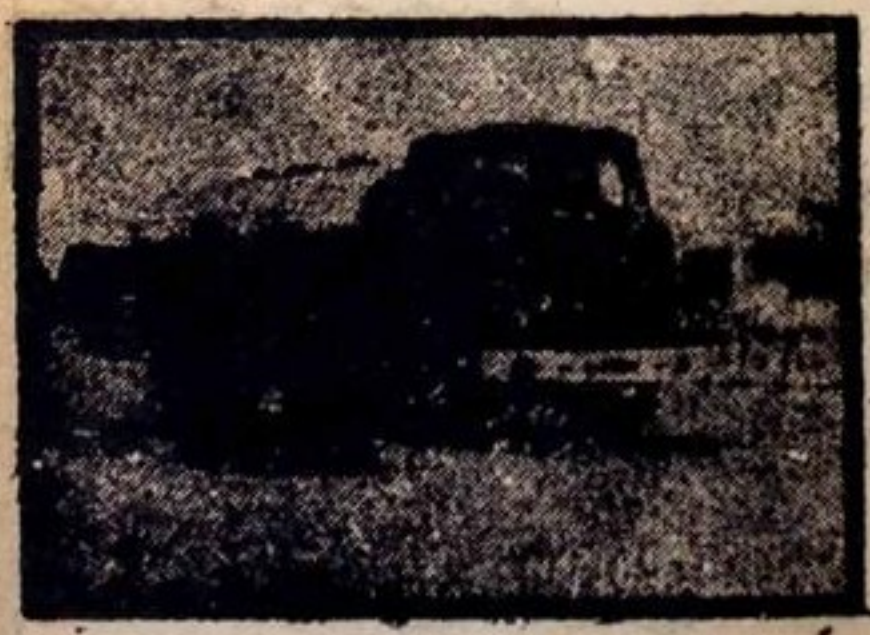

برماشیل

کا آپ کی زندگی سے گہرا تعلق ہے

ہماری مطبوعات

انتقادیات مولانا نیاز فتحپوری کے معرکۃ الآرا ادبی، تحقیقی اور تنقیدی مقالات کا مجموعہ جن کی نظیر نہیں ملتی، اردو زبان، اردو شاعری، غزل گوئی کی رفتار ترقی اور ہر بڑے شاعر کا مرتبہ متعین کرنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ یہ کتاب اس اہمیت کی بنا پر پاکستان کے کالجوں اور یونیورسٹی کے اعلیٰ امتحانات میں شامل ہے۔ قیمت :- چار روپے ۵۰ پیسے

تاریخ کے گمشدہ اوراق حضرت نیاز کے چوبیس افسانوں کا مجموعہ تاریخ و انشائے لطیف کے امتزاج کا بلند ترین معیار قائم کرتے ہیں۔ ان افسانوں کے مطالعے سے واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ ہیں جنہیں حضرت نیاز کی انشا نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔ قیمت :- دو روپے

ایک شاعر کا انجام جناب نیاز کے عنوان شباب کا لکھا ہوا طویل افسانہ جس کا ایک ایک جملہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیت سے معمور ہے یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشا کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ اس کی نظیر نہیں ملتی۔ قیمت :- ایک روپیہ

شبنمستان کا قطرۂ گوہرین مولانا نیاز فتحپوری کے بہترین افسانوں کا مجموعہ جس میں حسن بیان، ندرت خیالات اور پاکیزگی کے بہترین شاہکار پیش کئے گئے ہیں۔ ہر افسانہ اپنی جگہ معجزہ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ قیمت :- ایک روپیہ ۲۵ پیسے۔

نقاب اُٹھ جانے کے بعد مولانا نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ہادیان طریقت اور علمائے کرام کی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کے لئے کس درجہ سم قاتل ثابت ہوتا رہا ہے۔ زبان، پلاٹ اور انشا کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ قیمت :- ۷۵ پیسے۔

جذباتِ بھاشا مولانا نیاز فتحپوری نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ ہندی شاعری کے نمونے پیش کر کے ان کی تشریح ایسے تحقیقی انداز میں کی ہے کہ دل بیتاب ہوتا ہے۔ اردو میں یہ پہلی کتاب ہے جو اس موضوع پر لکھی گئی اس میں ہندی کلام کے بے مثل نمونے ہیں۔ قیمت ایک روپیہ ۲۵ پیسے

دفتر:- نگار پاکستان۔ ۳۲ گاندھی گارڈن مارکیٹ۔ کراچی ۳

مشہور آفسٹ پریس میکلوڈ روڈ کراچی میں طبع ہوا۔

زندگی اور ادب

(شاہانِ اودھ کے عہد میں)

ڈاکٹر سیّد صفدر حسین

ادارہ ادب عالیہ ۳۲ گاندھی گارڈن کراچی نمبر ۳

تعارف

زندگی اور ادب (شاہان اودھ کے عہد میں) یہ ہے عنوان اس بسیط مقالے کا جسے سید صفدر حسین صاحب نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری کیلئے پنجاب یونیورسٹی میں پیش کیا تھا۔ یہ مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں زوالِ دلّی کے اسباب پر مورخانہ تبصرہ کیا گیا ہے۔ دوسرا باب، اودھ کی داستان عروج و استحکام کیلئے وقف ہے۔ تیسرے باب میں اودھ کے تمدن و تہذیب پر گفتگو کی گئی ہے۔ چوتھا باب دلّی و لکھنؤ کے ثقافتی و سماجی اختلاف و ارتباط کے بیان سے متعلق ہے۔ اور پانچویں باب میں لکھنوی ادب کے داخلی و خارجی محرکات کے پیش نظر وہاں کی ادبی تخلیقات کا نہایت تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ جس میں نظم و نثر دونوں شامل ہیں۔

ڈاکٹر صفدر حسین کا یہ مقالہ اس [illegible] تاریخ ادب اردو میں بڑا مہتم بالشان اضافہ ہے۔ اور ہر اس شخص کیلئے جو ادب اردو سے دلچسپی رکھتا ہے (خواہ یہ دلچسپی معلمانہ ہو یا متعلمانہ) اس کا مطالعہ افادیت سے خالی نہیں۔ اس لئے ہم حد درجہ شکر گذار ہیں فاضل مقالہ نگار کے جنہوں نے اس کی اشاعت کیلئے "نگار" کو منتخب فرمایا۔

ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ پورا مقالہ اپنی اصل ترتیب کے لحاظ سے شائع کیا جاتا۔ لیکن چونکہ معاملہ "زلف کے سر ہونے تک" زندہ رہنے کا تھا۔ جو بظاہر مشکل نظر آتا ہے۔ اسلئے ہم صرف پانچویں باب کو جو بجائے خود ایک مستقل [illegible] کی حیثیت رکھتا ہے۔ بالاقساط شائع کر رہے ہیں۔

نیاز

فنکار اپنی تخلیقی کاوش میں دنیا سے چاہے کتنا ہی الگ یا بلند ہونے کی کوشش کرے۔ پھر بھی وہ دنیا ہی کا ایک فرد ہوتا ہے۔ اور نظام معاشرہ کے دوسرے افراد کی طرح اسی زمین پر رہتا ہے، معاشی مشکلوں کو انہیں کی طرح سہتا اور اجتماعی نفسیات کا پیرو ہوتا ہے۔ ممکن ہے وہ اپنے ماحول سے کچھ آگے بڑھ کر دیکھ سکے۔ لیکن حدود زماں و مکاں کو توڑ کر وہ روحِ عصر کو بالکل نہیں ٹھکرا سکتا۔ اس کی کوششوں کو شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے زمانے کے میلانات سے متاثر ہونا پڑتا ہے۔ وہ سیاسی پابندی اور معاشی گرفت سے دامن بچا کر نہیں نکل سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ بہزاد، تان سین اور فردوسی اپنی بے پناہ تخلیقی قوتوں کے باوصف اپنے عصری رجحانات کے آئینہ دار رہے۔ اور اگر وہ ایسا نہ کرتے تو ان کی آوازیں مبہم اور ان کے کارنامے مہمل ہو کر رہ جاتے۔ اسلئے یہ نتیجہ نکالنا دشوار نہیں کہ ہر فن آفاقی ہوتے ہوئے بھی اپنے عہد کی تہذیب و تمدن کی عکاسی کیلئے مجبور ہے۔ اور اسی مجبوری کا فیض ہے کہ ہم قدیم عمارات اور پرانے نقوش کو دیکھ کر اس عہد کی تہذیب کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ موہن جوداڑو کے دفینے۔ اڑلیسہ کے قدیم مندر ٹیکسلا کے آثار۔ اور اجنتا کی تصویریں اسی قبیل کی تاریخی عکاسیاں ہیں۔

دوسرے فنون کے مقابلے میں شعر و ادب زندگی کے آئینہ دار ہونے کی صلاحیت نسبتاً زیادہ رکھتے ہیں۔ یہ گویا تمدن کی ایک اشاریاتی تاریخ ہوتے ہیں جن سے مختلف ادوار کے ضمیر و خمیر، اقدار و ثقافت کا تصور قائم ہو جاتا ہے۔ اور اسی لئے ادب اپنے عہد کی سماجی زندگی کا ترجمان بھی ہے اور کسی حد تک پابند بھی۔

والٹ وٹکس نے سچ کہا ہے کہ تخیل کی ہر پیداوار اسی دنیا کا عکس ہوتی ہے جس میں صاحب تخیل زندگی بسر کرتا ہے۔ اسے اپنی عہد میں ادب کی تخلیقات پر حکم لگانے کیلئے اس عہد کے ذہنی موقف کو بھی سامنے رکھنا ضروری ہے۔ ہمارے قدیم ادب نے زندگی کا محض ساتھ دیا ہے اسکی اصلاح پر توجہ نہیں کی۔ یہ دوسری بات ہے کہ غیر شعوری طور پر ادب کے کسی حصے نے اصلاحی کام بھی انجام دے دیا ہو۔ لیکن عام طور پر غدر سے پہلے کی اردو شاعری بے مقصد اور غیر افادی تھی۔ اسلئے لکھنؤ کی ادب کو پرکھنے کیلئے ہمیں اس دور کے نظریات کی خاص رعایت رکھنی پڑے گی۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ لکھنؤ کے ادب نے اپنے عہد کی زندگی کی بڑی سچی تصویر پیش کی ہے۔ اسلئے کہ وہ وہاں کی زندگی کی طرح متنوع، دلکش، رنگین و شوخ ہے۔ اور ہر ذوق کی تسکین کا سامان مہیا کرتا ہے۔ یہاں کی شاعری میں روحانیت، اخلاق، تصوف، دردمندی، عشق کی سپردگی، وارداتِ قلب، سوز و تپش، جذبات اور زبان کی سادگی اور صفائی کے عناصر بھی کسی حد تک ضرور ملتے ہیں۔ اور اصناف ادب کا تنوع، مجازی عشق، جسمانی حسن، مضمون بندی، قافیہ پیمائی، تمثیل نگاری اور زبان کی ظاہری خوبیوں کا رکھ رکھاؤ بھی ہے۔ لیکن اس ادب پر تنقید کرنے والوں نے یا تو زندگی اور ادب کے رشتہ کو نظر انداز کر دیا ہے یا اس کے کسی مخصوص پہلو کو قابل اعتراض قرار دیکر مسترد کر دیا ہے

تاریخی اعتبار سے لکھنؤ کی سماجی زندگی تین مختلف ادوار میں منقسم ہو سکتی ہے۔ پہلا دور اودھ میں برہان الملک کی آمد سے شروع ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ صلح نامہ الہ آباد (۱۷۶۵ء / ۱۱۷۹ھ) تک اودھ کو ثقافتی مرکز کی حیثیت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ اسلئے شجاع الدولہ سے قبل کا حصہ نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ شجاع الدولہ کا زمانہ وہ وقت ہے جبکہ ایک طرف تو اودھ کی تہذیبی مرکزیت اور سیاسی اہمیت کا سنگ بنیاد رکھا جاتا ہے۔ اور دوسری طرف اودھ کا سیاسی رشتہ دلی کے بجائے کلکتہ سے زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے اس زمانے میں اودھ کے شاہانہ دربار کی بنیاد رکھی گئی۔ مولف تاریخ فرح بخش نے اس زمانے میں اودھ کے مشاغل اور زندگی

کے ہمہموں کا ذکر جس جوش و خروش کے ساتھ کیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ فیض آباد کو تمام ہندوستان کے مقابلے میں ایک مرکزیت حاصل ہوگئی تھی۔ اور شجاع الدولہ کی دولت و ثروت، داد و دہش، حکمت عملی، اور احساس قوت نے کچھ مدت کیلئے لوگوں کے دلوں سے زوال سلطنت اور نکبت و افلاس کا تصور مٹا دیا تھا۔ جب دلی کے تباہ حال گھرانے، مرہٹوں، جاٹوں درانیوں اور افغانوں کے ستائے ہوئے خاندان فیض آباد کی چہل پہل والی فضا میں داخل ہوئے تو ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ معاشی زندگی سے چھٹکارا مل جانے پر انہیں یقین سا ہو چلا کہ فیض آباد دلی کے تہذیبی زوال کو سنبھال لے گا اور علوم و فنون کے ساتھ ساتھ فنکار بھی تباہ حالی سے بچ جائیں گے۔ وہ غریب یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ اودھ کی یہ تمام چہل پہل دو تباہیوں کے درمیان ایک جلوۂ گریز پا سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔

تقریباً دس سال نہایت شان و شوکت سے گزار دینے کے بعد شجاع الدولہ کی زندگی ختم ہو گئی۔ ان کی حیات تک اودھ کی سیاسی قوت روز افزوں ترقی کرتی رہی۔ شجاع الدولہ انگریزوں کے جال میں پھنسنے کے باوجود علاقے پر علاقہ بڑھائے چلے جا رہے تھے۔ اور اپنی بلند ہمتی سے نہ کبھی خود کو کمپنی کا فرمانبردار سمجھتے تھے اور نہ دہلی کا۔ انگریزوں سے تخفیف فوج کا وعدہ کرنے کے باوجود اپنی فوج بڑھاتے رہے اس حوصلہ افزا عروج کے ساتھ دربار اور شہر میں چہل پہل تھی۔ گلی گلی حسن، علم اور فن کا چرچا تھا۔ خوشحالی کی وجہ سے لوگوں کی زندگی میں اطمینان اور مسرت کی لہر دوڑ گئی تھی۔ شاہی گھرانے سے جن شعرا کا تعلق تھا ان میں سودا، بوعلی، ہاتف، اشرف علی، خان فغاں، میر ضاحک، اور جعفر علی حسرت، خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، ان شاعروں کے دواوین اٹھا کر دیکھئے سب کے یہاں آپ کو زندگی کا رجائی پہلو نمایاں نظر آئے گا۔ ان کے کلام سے سوسائٹی کی خوش طبعی اور شگفتگی کا سراغ ملتا ہے۔ اس وقت دلی کی شاعری زیادہ تر ہجو ہو کر رہ گئی تھی۔ یہاں تک کہ میر و سودا تک کے یہاں بھی اس پست اخلاقی کے نمونے پائے جاتے ہیں۔ اس رنگ کا لکھنؤ میں منتقل ہونا اور زیادہ قرین قیاس تھا کیونکہ یہاں دلی کے مقابلے میں زیادہ عیش و عشرت اور دولت و فراغت تھی۔ اسلئے ہم دیکھتے ہیں کہ اودھ آکر بوعلی ہاتف حکیم آفتاب کی ہجو لکھتے ہیں۔ سودا اپنے معاصرین کے ایک جم غفیر پر جن میں میر ضاحک، فدوی، مولوی، ساجد، بوعلی ہاتف، اور مرزا فاخر، مکیں سب ہی شامل ہیں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ میر ضاحک اور میر حسن، سودا کی خبر لیتے ہیں۔ اشرف علی خاں فغاں، راجہ رام نرائن کو طنز و تضحیک کا نشانہ بناتے ہیں۔ مانا کہ یہ سب شاعر دلی سے آئے تھے۔ لیکن یہاں کی کھلنڈری زندگی اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے جذبے نے ان کی طبیعتوں کو اکسا دیا۔ اور بقول صفیر بلگرامی یہ امیروں کا کھلونا بن گئے۔ ان شگفتہ مزاجوں کی ہجویات میں سودا کا ذخیرہ سب سے زیادہ ہے۔ لیکن اس عہد میں کچھ شاعر ایسے بھی تھے۔ جنہوں نے سودا کا بھی ناطقہ بند کر دیا تھا۔ مثلاً میر ضاحک ان کے متعلق فرماتے ہیں۔

سودا کی ہجویات کو ضاحک نہ دیکھ وہ — جلدی جلا دے اس کے یہ ابیات کر کے تہہ
پوچھے اگر وہ کیا مری تقصیر تو یہ کہہ — ایں زادۂ زیاد نہ کرد ست ہیچ گہہ
نمرود ایں عمل کہ تو شداد کردہ

شیرازی تھا نہ باپ ترا اور نہ آملی — وہ خرس گر مغل کوئی ہوگا تو کابلی

گوناں گوں شعر کہنے پہ تیری زباں کھلی ہرگز کسے نہ آیدت آغا علی قتلی!

زیں گفتگو عبث دل خود شاد کردِ

اشرف علی خاں فغاں نے شجاع الدولہ کے دیوان راجہ رام نرائن کے بخل پر اس طرح طنز کیا تھا ۔:۔

اللہ من دہاند و شیطاں نمی دہد نواب من دہاند و دیواں نمی دہد

شیطاں ازیں عمل بہ تحیر فتادہ است گندم چرا بحضرت انساں نمی دہد

ایرانیاں بدرگہِ او نوحہ من کنند چیزے بنام شاہِ خراساں نمی دہد

تورانیاں بہ کلبۂ احزاں نشستہ اند حبہ برائے حضرت ایشاں نمی دہد

شاگرد پیشہ سیلی استاد من خورد یک چوب خشک در کفِ دربان نمی دہد

ہجویات سے قطع نظر اس عہد کے قصیدے اور غزلیں بھی خوش طبعی سے خالی نہیں۔ اور یہ تغیر تمدن و معاشرت کے اطمینان اور فراغت کا آصف الدولہ اپنے باپ کے مقابلے میں ذہین و کردار کے لحاظ سے کمزور تھے اس لئے وہ اپنے بعض درباریوں اور انگریز افسروں کے ہاتھ میں کھلونا بن کر رہ گئے ۔ ان کے عہد حکومت میں اودھ سیاسی اعتبار سے کمپنی کی فرمانبرداری کی حدود میں داخل ہو گیا ۔ اس زمانے سے سیاسی اقتدار کیلئے نواب وزیر اور رزیڈنٹ میں کشمکش پیدا ہو گئی ۔ اگرچہ فتح بظاہر نواب کی نظر آتی تھی ۔ لیکن یہاں کچھ ایسے با اقتدار سیاسی مطلب پرست بھی موجود تھے جو اپنی ذاتی منفعت کی وجہ سے اندرونی طور پر رزیڈنٹ کا ساتھ دیتے تھے ۔ ان زمانہ سازوں کے وجود نے شہر میں ایک طرح کی دورنگی پیدا کر دی تھی ۔ عوام ایک طرف تو دولت فراواں کے ساتھ ساتھ خوشحالی، بے فکری اور شہر کی رونق دیکھتے تھے ۔ اور دوسری طرف انہیں انگریزوں کی بڑھتی ہوئی قوت نظر آتی تھی ۔ ایک طرف وہ دیکھتے تھے کہ نواب وزیر نے رزیڈنٹ کی مرضی کے خلاف حیدر بیگ خاں نائب اور ٹکیٹ رائے دیوان کو برطرف کر دیا ہے ۔ لیکن دوسری طرف انہیں محسوس ہوتا تھا کہ علامہ تفضل حسین خاں کو نیابت رزیڈنٹ کی سفارش ہی پر ملی ہے ۔ ایک طرف وہ دربار کی شان و شوکت، شاہی عمارات اور شہر کی تعمیر و تزئین کو دیکھتے تھے ۔ اور دوسری طرف یہ کہ نواب وزیر گورنر کے استقبال کیلئے الہ آباد تک جاتا ہے ۔ اور بڑے تزک و احتشام سے لکھنؤ میں اسکی دعوت کی جاتی ہے ۔ یہ اور بعض ایسی ہی دوسری باتیں عوام کے دماغ میں انگریز کی برتری کا خیال پیدا کر رہی تھیں ۔ عوام کو دلی کے مصائب کے بعد خدا خدا کر کے ادھر میں ایک گوشۂ امن میسر آیا تھا ۔ لیکن اب وہ ڈر رہے تھے کہ کہیں یہ بھی ہاتھ سے نہ نکل جائے یہی وجہ تھی کہ اگر ایک طرف ان میں عیش و عشرت کا رجحان پایا جاتا تھا ۔ تو دوسری طرف وہ مذہبی احساس سے بھی بیگانہ نہ تھے ۔ اس لئے اس زمانہ میں نشاط اور دردمندی کے عناصر ملے جلے نظر آتے ہیں ۔ دربار اور امراء سے جو شعرا وابستہ تھے ۔ ان میں میر سوز، میر تقی میر، میر قمر الدین منت، حیدر علی، حیران اور میر حسن خاص اہمیت رکھتے ہیں ۔

اس وقت اودھ ولولہ انگیز سیاسی اور سماجی فضا کے بجائے ایک طرح کی دورنگی بلکہ کسی حد تک افسردگی کا شکار تھا ۔ اس لئے وہ دلی کی دردمندانہ روایات کو رواج دینے میں کسی حد تک ضرور کامیاب رہے ۔ اس زمانہ میں دربار لکھنؤ کے علاوہ کئی ولیعہد خوار سرکاریں اور بھی تھیں ۔ جو اپنے ادبی ذوق کی تکمیل کیلئے شعرا کی بھی سرپرستی کرتی تھیں ۔ ان میں سب سے اہم سرکار دلی کے ولیعہد مرزا جواں بخت جہاندار شاہ کی تھی ۔ جو ۱۱۹۵ھ (۱۷۸۳ء) میں لکھنؤ آ گئے تھے ۔ ان کے متعلق صاحب گلشن ہند نے لکھا ہے کہ ۔ اس شہزادہ عالی

تبار کی طبیعت شعر کی طرف اسقدر آئی تھی کہ مہینہ میں دو مرتبہ بنا مشاعرے کی اپنے دولت خانہ میں ٹھہرائی تھی۔ شعرائے باوقار کو اپنے چوبدار بھیج کر مشاعرے کے دن بلاتے تھے۔ اور ہر شخص کے ساتھ نہایت الطاف و عنایات سے گرم جوشی فرماتے تھے[1]۔ مرزا محمد اسمٰعیل عرف مرزا جان طپش اور جعفر علی حسرت اسی سرکار سے وابستہ رہے۔ دوسری سرکار ان کے چھوٹے بھائی مرزا سلیمان شکوہ کی تھی جو ۱۲۰۵ھ ۱۷۹۰ء میں دلی چھوڑ کر لکھنؤ آ گئے تھے۔ اودھ کے شاہی خزانے سے اس شہزادہ کو چھ ہزار روپے ماہوار وظیفہ ملتا تھا۔ اپنے بڑے بھائی کی طرح یہ بھی شعر و ادب کی خدمت کا جذبہ رکھتے تھے۔ چنانچہ لکھنؤ میں ان کے دامن دولت سے بھی بعض شعرا وابستہ تھے۔ جن میں انشاء مصحفی اور جرأت زیادہ مشہور ہیں۔ ان دونوں شہزادوں کے علاوہ نواب محمد خان پسر حافظ رحمت خان، نواب حسن رضا خان نواب مرزا نوازش علی خان، نواب مرزا محمد تقی ہوس، نواب مرزا زین العابدین خان عرف مرزا مینڈھو سرسبز، نواب حسن علی خان خان الماس علی خان خواجہ سرا، رائے میکو لال، راجہ ٹکیت رائے، ممتاز الدولہ، جونسن بہادر بھی بعض شعرا کی سرپرستی کرتے تھے۔ لیکن دربار آصفی کے ادبی جلسوں میں ہم کو ایک پروقار فضا نظر آتی ہے۔ اور دوسرے امرا کی سرکاروں میں شعرا کی باہمی لاگ ڈانٹ۔ جو اپنا اثر رسوخ بڑھانے کے خیال سے اکثر ایکدوسرے سے الجھ پڑتے تھے اور کبھی کبھی بات بڑھ کر مجادلوں تک نوبت پہنچ جاتی تھی۔ لکھنؤ کا سب سے مشہور ادبی ہنگامہ انشاء اور مصحفی سے تعلق رکھتا ہے۔ انشا جنہیں علم و فضل کے علاوہ فن مصاحبت میں بھی بڑا کمال حاصل تھا رشد آباد میں نواب میر قاسم، فیض آباد میں نواب شجاع الدولہ اور دلی میں شاہ عالم کے درباریوں میں رہ چکے تھے۔ وہ بالطبع ہنسوڑ، پھبتی باز اور زبان دراز واقع ہوئے تھے۔ وہ ادبی جلسوں میں کسی کی کو چھیڑ دیتے تھے اور نوبت مکروہ ہجو بازی تک پہنچ جاتی تھی۔ چنانچہ مرشد آباد میں مرزا قدیک عظیم آبادی سے، دلی میں مرزا عظیم بیگ، اور قدرت اللہ قاسم سے، لکھنؤ میں مولانا فائق اور مصحفی سے ان کے معرکے ہوئے۔ مصحفی سے ان کا پہلا معرکہ مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں ہوا۔ جب انشا نے مصحفی کی "حور کی گردن اور کافور کی گردن" والی غزل پر بعض اعتراضات کئے۔ تو مصحفی نے تلخی کے ساتھ اس کا جواب لکھا۔ اور دونوں اساتذہ میں شدید اختلاف پیدا ہو گیا۔ مصحفی لکھنؤ میں اپنے شاگردوں کی ایک کثیر جماعت رکھتے تھے جن میں بعض ذی اثر تھے اور بعض شورش پسند اسلئے ان کے مزاج میں کچھ تمکنت آ گئی تھی۔ اور چونکہ وہ زندگی کے معرکوں میں کامیاب نہیں رہ سکے تھے اسلئے پیہم شکستوں کے باعث ان میں عجب و غرور بھی پیدا ہو گیا تھا۔ مصحفی کبھی جرأت سے بھی الجھ چکے تھے۔ لیکن جرأت نے دب کر صلح کر لی تھی۔ انشا اپنی گوناگوں صلاحیتوں کی وجہ سے مصحفی سے شکست کھانے والے نہیں تھے۔ چنانچہ ان معرکوں میں مصحفی کو اپنے شاگردوں کی فوج کے باوجود نیچا دیکھنا پڑا۔ کیونکہ سلیمان شکوہ اور دوسرے امرا نے بھی انشا ہی کا ساتھ دیا۔

لکھنؤ میں اس طرح کے جو ہنگامے رونما ہوئے وہ ہر چند دلی سے آئے ہوئے شعرا اور دلی ہی کے ایک شہزادے کی سرکار سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن ان شور شوں نے غیر شعوری طور پر لکھنؤ کے شاعروں کو متاثر کیا اور دونوں حریفوں کے شاگردوں نے جن میں بعض لکھنؤ کے بھی تھے۔ غزلوں میں چھیڑ چھاڑ اور قافیہ پیمائی شروع کر دی۔

یہاں تک ہم نے اودھ کی دو سرکاروں کے ہمعصر شعراء کا جائزہ لیا ہے۔ ہر چند دونوں کی صلاحیت نفسیات اور مذاق یکساں نہ تھے۔ لیکن چونکہ دونوں باپ بیٹے تھے۔ اسلئے دونوں کا دربار تھوڑے بہت فرق کے ساتھ ایک ہی وقار رکھتا تھا۔ اس فضا میں تعیش کے عناصر تیز تھے۔ زندگی کا رنگ عام طور پر فارغ البالی اور عیش پسندی کی طرف مائل تھا۔ دربار کے ملک الشعراء میر تقی میر اگرچہ اپنے

---

[1] تذکرہ گلشن ہند

دل کی برشتگی کی وجہ سے زیادہ تر دردمندانہ جذبات ہی کو نظم کرتے تھے۔ لیکن ماحول کی رجائیت کے باعث ان کے رنگ و آہنگ میں بھی فرق آگیا تھا۔ ان کی کائنات یعنی ان کے لہجے کی افسردگی میں بھی دھیما پن پیدا ہو گیا۔ اور احساس حسن میں بھی محبوب کی دلبرانہ ادائیں زیادہ نظر آنے لگیں۔ میرے مقابلے میں آصف الدولہ اور میر حسن جو خالص پورب کے تربیت یافتہ شاعر تھے اپنے دور کی زیادہ سچی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کے کلام میں قدیم فنی اور تکنیکی روایات تو قائم رہیں۔ لیکن دلی کے تجریدی عشق کا زور کم ہو کر ارضی محبت اور مجازی حسن کا احساس بڑھ گیا۔ زندگی کے خارجی مظاہر پر نظر رکھنے کی وجہ سے میر حسن نے اپنی مثنوی میں لکھنو کی نشاط انگیز زندگی کی تصویریں نہایت وضاحت اور تفصیل کے ساتھ پیش کیں۔ اسی زمانے میں یہاں شیعیت کا سنگ بنیاد رکھا گیا اور مذہب کی خاص قدروں نے فروغ پایا۔ اسلئے سودا اور ان کے بعض معاصرین نے ادبی احساس کے ساتھ مرثیہ کہا۔

آصف الدولہ کے بعد جب سعادت علی خاں حکمران ہوئے تو سیاست نے ایک نئی کروٹ لی۔ کمپنی نے فوج کے مصارف اور دوسرے اخراجات کے سلسلے میں نواب اودھ سے نصف ملک لے لیا۔ اس نئے معاہدے سے ملک کی آمدنی تو ضرور نصف رہ گئی۔ لیکن آئے دن کے انگریزی مطالبات نے ریاست کیلئے جو مادی مشکلات پیدا کر رکھی تھیں ان سے نجات مل گئی۔ اب ملک بیرونی اور اندرونی خطرات سے بالکل محفوظ ہو گیا۔ لیکن اس سیاسی تبدیلی نے نواب وزیر کی نفسیات کو کافی متاثر کیا۔ کیونکہ ایک طرف تو نصف ملک دیدینے کی ذمہ داری خود انہیں پر عائد ہوتی تھی دوسرے رزیڈنٹ کرنل جان بیلی سے حدود و اختیارات کے سلسلے میں رات دن چپقلش رہتی تھی۔ اسلئے نواب ہر معاملہ میں پھونک پھونک کر قدم رکھتے تھے۔ تاہم انہوں نے باقی ماندہ علاقے کا انتظام اس حسن لیاقت سے کیا کہ بہت تھوڑے عرصہ میں بازاروں میں رونق، کاروبار میں چہل پہل اور زندگی میں چمک دمک بڑھ گئی۔ اودھ کے شاہی خزانے کے اعداد و شمار بڑی تیزی کے ساتھ بڑھتے بڑھتے ۱۴ کروڑ تک پہنچ گئے تھے۔ نواب بالطبع شوخ مزاج، عیش دوست اور حسن پرست واقع ہوئے تھے۔ لیکن اب ان میں جذبۂ احتیاط بھی پیدا ہو گیا تھا۔ انہوں نے بہت سے درباری مصارف میں تخفیف کر دی۔ شعراء میں انشاء اللہ خاں انشاء ان کے ملازم تھے۔ لیکن دربار سے باہر مصحفی، جرأت اور ان کے بعض معاصرین اور شاگردوں کا شہر تھا۔ اس وقت علامہ تفضل حسین خان وزیر السلطنت تھے جنہوں نے درباری شعر و سخن کے رجحان کو علم و فضل کی طرف مائل کیا۔ اور انشاء نے بعض ادبی خدمات بھی انجام دیں۔ جن میں داستان رانی کیتکی اور سلک گوہر کے علاوہ دریائے لطافت بھی شامل ہے۔ جو انہوں نے ۱۲۲۲ھ (۱۸۰۷ء) میں قتیل کی شرکت میں لکھی۔ اس زمانے میں ناسخ نے اپنی لسانی اصلاح کا کام شروع کیا۔ جس کا اعتراف مصحفی نے بھی ۱۲۲۴ھ (۱۸۰۹ء) میں اپنے دیوان ششم کے دیباچہ میں کیا ہے۔

اس زمانے میں انشا کی طبیعت کچھ درباری احترام کچھ عمر کی پختگی کے باعث معرکہ آرائیوں سے ہٹ کر شگفتہ مزاجی پر آکر ٹھہر گئی تھی اور مصحفی بھی افسردہ ہو کر اعتدال پر آگئے تھے۔ اسلئے شاعری میں دو رجحانات صاف نظر آتے ہیں۔ ایک شگفتگی اور دوسرے علم و فن کی نمائش۔ انہوں نے نئی نئی زمینیں تلاش کیں، قافیہ بندی میں جدت و ندرت کا مظاہرہ کیا، نئے مضامین پیدا کئے۔ انشاء، مصحفی اور جرأت اس دور کے نمائندے ہیں۔ ان کے یہاں نشاط اور فن کے عناصر عام طور پر ملتے ہیں۔ سب کو طویل غزلیں کہنے کا شوق ہے اور مشکل ردیف و قوافی میں بھی اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ محبوب کے جسمانی سبھاؤ کا احساس ان تینوں استادوں کے کلام میں اپنے پیشروؤں سے بہت زیادہ ہے۔ اور انفرادی رجحانات کی وجہ سے یہ عنصر جرأت کے یہاں زیادہ پایا جاتا ہے۔ اس دور کی بہتر

نمائندگی انشا نے کی۔ کیونکہ وہ درباری تقاضوں کو زیادہ بہتر سمجھتے تھے۔ انہوں نے نثر میں داستان رانی کیتکی اور سلک گوہر لکھیں لسانیات میں دریائے لطافت ترتیب دی، اور شاعری کی اصناف میں غزل، قصیدہ، اور ریختی پر خاص توجہ دی۔ اس زمانے کا رجحان چونکہ قافیہ اور ردیف کے صناعانہ استعمال کی طرف زیادہ تھا۔ اسلئے مثنوی کو خاص فروغ حاصل نہ ہو سکا اور قصیدہ بھی مناسب تخیلی اور تمثیلی مواد کی کمی کے باعث اس جوش و خروش تک نہ پہنچ سکا۔ جو سودا کے یہاں پایا جاتا تھا۔ کیونکہ سودا کا ممدوح شجاع الدولہ تھا۔ اور انشاء و مصحفی کے ممدوح سلیمان شکوہ اور سعادت علی خاں تھے۔ جو شجاع الدولہ کے مقابلے میں بہت کم حیثیت رکھتے تھے اس وقت ایک اور چیز پچھلے دور کے مقابلہ میں زیادہ نمایاں ہو گئی۔ اور وہ نسوانی اداؤں کا احساس ہے۔ احساس لباس احساس جسم اور احساس ادا سب کچھ شامل تھا۔

مصحفی :- رکھ کے دستار سجا آپ نے مردانہ لباس — رات تم نکلے تو پہ زور ہنر سے نکلے

" :- گورے بدن کا اس کے عالم میں رات دیکھا — اک نور کا جھمکڑا تھا پیرہن کے اندر

" :- سوتا ہے وہ جب ساتھ تو جی چاہتا ہے اپنا — اک پنکھڑی گل کی نہ ہو درمیان ہمارے

اس احساس کے ساتھ طربیہ و نشاطیہ کیفیات کے اظہار میں بھی غلو سے کام لیا گیا۔

انشاء :- معلوم نہیں رو دھلے ہیں کس آئینہ رو سے — پانی جو اترتا نہیں غنچوں کے گلو سے

" :- اب کوئی ہما ہو تو اسے ذبح کریں ہم — تعویذ بہت لکھ چکے ہدہد کے لہو سے

" :- تم تم یہ ترانے کے سے کیا بول ہیں صاحب — نفرت جو مجھے تم سے ہے سو وہ نہیں تو سے

" :- مشعل سے کوئی غول بیاباں کی جو دیکھے — تو بھی نہ کہیں شیخ جی صاحب سے مٹھو سے

" :- اب قافیے باندھ اور ہی انداز کے انشاء — ہے تجھ کو گذرنا شعرا کے سر کو سے

ان اشعار میں الفاظ قوافی اور خیالات ایسے ہیں جن سے شوخی، نظم، خوش باشی، ہنسی اور دل لگی کے ذوق کا پتہ چلتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ چھیڑ چھاڑ اور ہجو نگاری کا شوق غزل میں اپنا مقام پیدا کر رہا ہے۔

سعادت علی خاں کے بعد غازی الدین حیدر کا عہد آیا جو بڑے عیش کوش حکمران تھے۔ آپ کے زمانہ میں کمپنی نے چاہا کہ نواب اودھ تخت دلی کے برائے نام تعلق سے بھی آزاد ہو جائے۔ اور آخر کار ۱۲۳۳ھ (۱۸۱۸ء) سے لکھنؤ کے نواب وزیر شاہ اودھ تسلیم کر لئے گئے۔ یہ برائے نام مطلق العنان بادشاہت ایسے وقت میں قائم ہوئی جبکہ یہاں دربار کے قیام پر ایک قرن گذر چکا تھا۔ اور دلی سے آئے ہوئے زبان دانوں اور فنکاروں کی نئی نسل یہاں پیدا ہو چکی تھی۔ اتنی مدت کے استحکام نے ہر شعبۂ حیات میں اپنی مخصوص روایات قائم کرا دی تھیں۔ جو دلی سے مختلف تھیں اس کا آغاز آصف الدولہ کے زمانے سے ہو چکا تھا۔ لیکن جب دلی کے شاعروں اور فن کاروں نے لکھنؤ آ کر اس طرح کے دعوے کرنے شروع کر دیئے۔

خرابہ دلی کا وہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا — وہیں میں کاش مر جاتا سراسیمہ نہ آتا یاں

بعضوں کو گماں ہے یہ کہ ہم اہل زباں ہیں — دلی نہیں دیکھی ہے زباں داں یہ کہاں ہیں

صحرائے بیانِ پورب کیا جانتے ہیں اس کو — اے مصحفی جدا ہے انداز اس زباں کا

مشکلات غالب

جس میں مولانا نیاز فتحپوری نے غالب کے اردو کلام کے ہر شعر کی نہایت مختصر ، جامع ، واضح اور آسان تشریح کردی ہے۔ غالب کے سارے پیچیدہ اشعار کی باریکیوں اور نزاکتوں کو اس خوبی و سادگی سے اجاگر کیا گیا ہے کہ کلام غالب کو سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے میں کوئی دشواری باقی نہیں رہتی ۔

یہ کتاب غالب سے دلچسپی رکھنے والوں کیلئے عموماً اور طلباء کیلئے خصوصاً نہایت مفید اور لائق مطالعہ ہے۔

قیمت : دو روپیہ

عرض نغمہ

ٹیگور مشرق کے ان بلند مرتبہ شاعروں میں ہے جس کے روح پرور نغموں نے مشرق و مغرب دونوں کو یکساں متاثر کیا ہے۔ علامہ نیاز فتحپوری نے اس عظیم فنکار کے مجموعہ نظم ''گیت انجلی'' کو ''عرض نغمہ'' کے نام سے اردو میں منتقل کیا ہے ۔ یہ ترجمہ ٹیگور کی روح شاعری سے اس درجہ ہم آہنگ ہے کہ اس میں وہی سادگی پرکاری اور روح خیزی و دلکشی نظر آتی ہے جو ٹیگور کی شاعری میں ملتی ہے ۔ جو لوگ ٹیگور کی فنی دسترس ، شاعرانہ فطانت اور حیات پرور نغمات کی سحر آفرینیوں سے لطف اندوز ہونے کے آرزو مند ہیں ان کیلئے اس کتاب کا مطالعہ نہایت ضروری ہے اس لئے کہ ٹیگور کی شخصیت و فن سے بہرہ مند ہونے کیلئے اردو میں اس سے بہتر کوئی ترجمہ موجود نہیں ہے۔

قیمت : ایک روپیہ پچیس پیسے

نگارِ پاکستان کے خاص نمبر

اقبال نمبر (سالنامہ ۱۹۶۲ء) جسے پاکستان کے معجز بیان شاعر اقبال کے نام نامی پر موسوم کیا گیا ہے اس میں اقبال کی تعلیم و تربیت، اخلاق و کردار، شاعری کی ابتداء اور مختلف ادوارِ شاعری، اقبال کا فلسفہ و پیام، تعلیم اخلاق و تصوف، اس کا آہنگ تغزل اور اس کی حیات معاشقہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ قیمت:- تین ۳ روپے

مصحفی نمبر نگارِ پاکستان کا خصوصی شمارہ جس میں اردو ادب کے مسلم الثبوت استاد شیخ غلام ہمدانی "مصحفی" کی تاریخ پیدائش و جائے ولادت کی تحقیق، ان کی ابتدائی تعلیم، ان کی شاعری کے آغاز و تدریجی ارتقاء، ان کی تالیف و تصانیف، ان کی غزل گوئی و مثنوی نگاری، ان کے معاصر شعراء و ادباء اور ان کے اپنے دور کے مخصوص علمی و ادبی رجحانات پر محققانہ و عالمانہ بحث کی گئی ہے۔ قیمت:- تین ۳ روپے

نظیر نمبر نگارِ پاکستان کا خصوصی شمارہ۔ جس میں نظیر اکبرآبادی کا مسلک، اس کا فارسی و اُردو کلام میں عارفانہ رنگ اس کی قدرت بیان و زبان، اس کا معیاری تغزل، ادبیات اُردو میں اس کا فنی اور لسانی درجہ۔ اس کے امتیازات اور محاسن شعری۔ اس کا شاعری میں مقام، صناع و طباع شعراء کا فرق، معاصرین کی رائیں، مستند ادباء کی موافقت و مخالفت میں تنقیدیں اور اسکی خصوصیات و انداز شاعری پر سیر حاصل تبصرہ ہے۔ قیمت:- تین ۳ روپے

غالب نمبر سالنامہ ۱۹۶۱ء۔ جس میں مرزا غالب کی فارسی و اُردو شاعری کی خصوصیات کو بالکل نئے زاویے سے پیش کیا گیا ہے۔

یہ خاص نمبر اپنی جامعیت اور افادیت کے اعتبار سے طلباء اور شائقین ادب کے لئے بیحد مفید اور لائقِ مطالعہ ہے۔ قیمت:- چار ۴ روپے

ہندی شاعری نمبر جس میں ہندی شاعری کی مکمل تاریخ اور اس کے تمام ادوار کا بسیط تذکرہ موجود ہے۔ قیمت:- چار ۴ روپے

تصانیف مولانا نیاز فتحپوری

من و یزداں ۷ روپے ۵۰ پیسے	شہاب کی سرگزشت ۲ روپے	انتقادیات ۴ روپے ۵۰ پیسے	تاریخ کے گمشدہ اوراق ۲ روپے
نگارستان ۵ روپے ۵۰ پیسے	جذباتِ بھاشا ایک روپیہ ۲۵ پیسے	جمالستان ۵ روپے ۵۰ پیسے	مذاکرات نیاز ۲ روپے
مکتوبات نیاز (حصہ اول) ۴ روپے	فراست الید ایک روپیہ	گیت انجلی ایک روپیہ	مالہ و ما علیہ ۲ روپے
مکتوبات نیاز (حصہ دوم) ۴ روپے	نقاب اُٹھ جانیکے بعد ۷۵ پیسے	مشکلات غالب ۲ روپے	ترغیبات جنسی ۴ روپے ۵۰ پیسے
مکتوبات نیاز (حصہ سوم) ۴ روپے	ایک شاعر کا انجام ایک روپیہ	مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ ایک روپیہ ۷۵ پیسے	محمد قاسم سے حملہ بابر تک ۶ روپے ۵۰ پیسے

ادارہ ادب عالیہ کراچی ۱۸